از

سید محمد رضا ساجد رضوی

ایم اے صدر الافاضل

شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

لکھنؤ

نام کتاب ـــــــ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی
حیات اور کارنامے

نام مصنف ـــــــ سیّد محمد رضا ساجد رضوی ساجد زیدپوری

پبلیشر ـــــــ ساجد زیدپوری

سنہ اشاعت ـــــــ سنہ ۱۹۹۰ء

تعداد اشاعت ـــــــ ۵۰۰

مطبع ـــــــ نامی پریس لکھنؤ

کتابت ـــــــ اسرار احمد لکھنؤ

قیمت ـــــــ چھتیس روپے ۳۶/

تقسیم کار
اردو سماج
۷۵ - ڈاکٹر موتی لعل بوس روڈ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

ملاقات

۱۹۴۸ء میں جب میرا داخلہ سلطان المدارس میں ہوا تو پہلی بار ایک سینیر طالب علم کے اعتبار سے ساجد صاحب کا میرا تعارف ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ ہم لوگ بے تکلف دوست بن گئے اور ۱۹۴۸ء سے اب تک اس دوستی میں روز بروز اضافہ ہی ہوا ہے۔

مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس ہوتا کہ ادب و شاعری کے ذوق کو جلا بخشنے میں ان کا نمایاں رول رہا ہے۔ انھیں ادب و شاعری سے خاصی دلچسپی ہے لطف کی بات یہ ہے کہ خود بھی شاعر ہیں ان کی شاعری میں ایک خاص بات یہ ہے کہ آپ کی شاعری کو کسی خاص صنف میں محدود نہیں کر سکتے انھوں نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور احباب کے منع کرنے کے باوجود ہزلیں بھی کہی ہیں۔

چودھویں صدی کے آخری صدر الافاضل ہونے کا انھیں شرف حاصل ہے الٰہ آباد یونیورسٹی کے ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ شوق تعلیم نے مدرسہ کی بند فضا سے یونیورسٹی کی کھلی فضا کی سیر پر مجبور کیا۔ یونیورسٹی کے شعبۂ علوم مشرقیہ کی تمام اسناد حاصل کیں اس کے بعد بی اے اور فارسی ادب میں ایم اے امتیازی نمبروں سے پاس کیا فی الحال شعبۂ فارسی میں ریسرچ اسکالر ہیں اور باوجود ہم لوگوں کی دعاؤں کے

ابھی مجبور ہیں۔

زیرِ نظر کتاب فارسی ادب میں ان کی پہلی تحقیقی و تنقیدی کوشش ہے اس سے قبل ان کے اصلاحی و سماجی موضوعات پر مختلف مقالے شایع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت اس کے طرزِ تحریر میں آپکو ناہمواریاں نظر آئیں گی عام طور سے مصنفین کی آراء کو نقل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے جیسے مصنف عموماً کرتے ہیں۔

آخر میں صرف گذارش یہ ہے کہ آپ میری رائے کو غلط یا دوستی پر محمول نہ فرمایئے گا۔ اس لئے کہ دوستی اپنی جگہ پر ہے اور میری رائے اپنی جگہ پر ہے۔ دوسری التماس یہ ہے کہ آپ محترم ساجد صاحب سے ملے بغیر ان کی شخصیت کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کیجئے گا، ورنہ بعد میں شاید آپ کو اپنی رائے پر نادم و شرمندہ ہونا پڑے۔ آپ کتاب پڑھنے کے لئے بے چین ہوں گے اس لئے اب میں بہت زیادہ آپ کے اور کتاب کے بیچ حائل نہیں رہنا چاہتا اس دعا کے ساتھ اس ملاقات کو ختم کرتا ہوں کہ خدا ساجد صاحب کو ایک مخلص دوست اور غیر جانبدار ادب کا طالب علم بنائے تاکہ ان کی تصنیفات و تالیفات پر جانبداری کا الزام عاید نہ ہو سکے۔

۱۸۶/۴ - باغ گھاسی وزیر گنج
لکھنؤ

احتشام عباس حیدری

انتساب

ان تمام کرم فرماؤں کے نام

جنھوں نے

میری تعلیمی سرگرمیوں میں

کسی نہ کسی عنوان سے معاونت کی

ساجد زیدپوری

باب اوّل

فارسی زبان و ادب کا آغاز و ارتقاء

باب دوم

ہندوستان اور فارسی

باب سوم

فارسی اور ہندو

باب چہارم

شفیق اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی

باب پنجم

شفیق اورنگ آبادی کے کارنامے

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

دنیا نے اس کے ناز برابر اٹھائے ہیں
جس نے بھی شہر علم کے گوہر اٹھائے ہیں
ساجد زیدپوری

فارسی ادب میں ہندوستانیوں نے کافی خدمات انجام دی ہیں جس میں اہل ہنود اچھی خاصی تعداد میں شامل ہیں۔ عہد مغلیہ کو فارسی ادب کا زریں دور کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس دور میں فارسی ادبیات کو ایران سے زیادہ ہندوستان میں عروج حاصل ہوا یہی وجہ ہے کہ یہ دور تھا جس میں بہت سے ایرانی شعراء اور ادباء ایران کو خیر آباد کہہ کر ہندوستان میں مقیم ہوئے۔ اس کے علاوہ خود ہندوستانیوں نے اہل زبان کے شانہ بہ شانہ چل کر فارسی ادب کے ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا۔

فارسی ادبیات کی تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ایرانی مصنفین نے ہندوستان کے ادیبوں اور کارناموں کا ذکر یا تو نہیں یا بہت مختصر کیا ہے البتہ ہندوستانی مصنفین نے اس سلسلے میں بیشتر کتب تالیف کیں جن کی وجہ سے ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کے حالات اور کارناموں کا پتہ چلتا ہے لیکن ہندو شعراء کے تفصیلی حالات اور کارناموں پر کتابوں کی کمی ہے۔ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے ایم اے سال دوم کے اختیاری پرچے میں مضمون کے بجائے مقالہ اختیار کیا۔

مقالہ کے لئے "ممتاز ہندو شعراء" عنوان تجویز کیا تھا لیکن اساتذۂ کرام کی رائے یہ ہوئی کہ کسی ایک ادیب یا شاعر پر لکھا جائے تاکہ اس کے تفصیلی حالات اور کارناموں

کا مجموعہ مرتب ہو کر سامنے آجائے۔ اگر ممتاز شعراء پر لکھا جائے گا تو حالات اور کارناموں
کا تذکرہ لامحالہ مختصر کرنا پڑے گا اس لئے مقالہ کی افادیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مناسب
یہی ہے کہ کسی ایک ادیب یا شاعر پر لکھا جائے۔ اساتذۂ کرام کی رائے سے یہ اختلاف
کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا اس لئے صدر شعبہ استاد محترم ڈاکٹر ولی الحق صاحب
انصاری ادام اللہ ظلہ العالی سے مشورہ کے بعد مقالہ کا عنوان "میر محمد شفیق
حیات اور کارنامے" طے پایا۔

بہت جد و جہد کی لیکن کوئی ایسی کتاب جس میں امید تھی کہ ان کے حالات کا ذکر ہوگا
میسر نہ ہو سکیں جس کی وجہ سے کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا پھر بھی [illegible] سے
زائد کتابیں (جن میں تذکرے اور تاریخی کتب بھی شامل ہیں) پڑھیں جس سے معلوم
ہوا کہ بہت سے تذکرے نگار شفیق کے حالات کے بارے میں خاموش ہیں۔ ظاہر ہے اتنی
کتابوں کی دستیابی اور پھر اس میں ایسی کتابیں بھی جو نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں تن
تنہا ممکن نہ تھا اس سلسلے میں اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں میں مولانا سید [illegible] اصغر
صاحب زیدی مراد آبادی، احتشام عباسی حیدر تقی غازی پوری، محمد عارف فریدی الہ آبادی، محمد تقی علی
عابدی، نواب عالم رضوی، محفوظ قدوائی، فرید مہدی صاحبان، نیز [illegible] صاحبہ، رشیدہ
خاتون صاحبہ اور محترمہ تسنیم اختر صاحبہ نے کافی مدد کی جن کا تہہ دل سے شکر گزار
ہوں۔

ان اداروں کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جن سے فیض اٹھایا جس کے بغیر
یہ کام انجام پانا بہت مشکل تھا۔ ادارے کے نام یہ ہیں۔ ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی
سلطانیہ لائبریری سلطان المدارس لکھنؤ، کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
ممتاز ڈگری کالج لکھنؤ، امیر الدولہ پبلک لائبریری قیصر باغ لکھنؤ، مرکزی لائبریری، اردو
اکاڈمی لکھنؤ، گنگا پرشاد ورما میموریل لائبریری امین آباد لکھنؤ، آچاریہ نریندر

دیو لائبریری لکھنؤ، محبوب پبلک لائبریری کاظمین روڈ لکھنؤ اور کتب خانہ مدرسۃ الواعظین
لکھنؤ۔ ان تمام اداروں اور ان کے اراکین کا بہت بہت متشکر ہوں نیز محترم افضل حسین
صاحب کیفی الرضوی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے کتاب کے ہر ورق کی کتابت کر کے اسکے
حسن میں مزید اضافہ کیا۔

اس مقالہ کی ترتیب میں مولانا سید غلام مرتضیٰ صاحب نے بعض مفاہیم اور نکات
سمجھائے جس کیلئے ان کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اپنے
اساتذۂ کرام ڈاکٹر ولی الحق انصاری، ڈاکٹر نیر مسعود صاحب رضوی، ڈاکٹر سید احسن الظفر
صاحب اور ڈاکٹر خان محمد عاطف صاحب مدظلہم العالی کا بھی شکریہ جن کے مفید
مشوروں اور حوصلہ افزائی سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ آخر میں محترمہ ڈاکٹر آصفہ
زمانی صاحبہ دام ظلہا العالیہ کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جن کی نگرانی نے گہر ہائے
ادب کی چمک میں مزید اضافہ کیا۔

جواہرات ادب کا مجموعہ تکمیل کے مراحلے میں پہونچ گیا۔ ماہرین ادب اس
کی اہمیت سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس کی قدر و منزلت کوئی نہیں سمجھ
سکتا کیونکہ ع

نا اہل راز علم بصیرت کجا بود
در چشم کور خاک از توتیا بود (شفیق اورنگ آبادی)

فقط والسلام

سید محمد رضا ساجد رضوی
(زید پوری)

باب اوّل

فارسی زبان وادب کا آغاز وارتقاء

فارسی زبان کا آغاز

فارسی زبان کب وجود میں آئی اس کی وضاحت مشکل ہے۔ صحیح طور پر زمانے اور دور کا تعین نہیں کیا جاسکتا لیکن اس سلسلے میں جو اشارے ملتے ہیں ان کے سہارے کافی حد تک فارسی کی قدامت کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔

سخندانِ فارس[1] کے مطابق سیامک جن کے لیے بعض افراد کا کہنا ہے کہ حضرت شیث پیغمبر وہی تھے جن کو ان کی نیک نیتی اور دانش کی برکت سے پارسا کا خطاب ملا تھا۔ انھوں نے اسی وجہ سے اس ملک کا نام "پارس" رکھا جس کے معنی مقدس اور پاک کے ہیں۔

مذکورہ بیان پر اعتماد کرتے ہوئے اگر یہ بات مان لی جائے کہ حضرت شیث

---

[1] سخندانِ فارس ص ۷-۶

پیغمبر علیہ السلام کے عہد میں پارس کا وجود ہو چکا تھا پھر بھی فارسی زبان کے وجود کا مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ جہاں تک ہمیں تاریخی کتابیں بتاتی ہیں کہ ابتدائے آفرینش میں زبانوں کا وجود نہیں ہوا تھا۔ لوگ اشاروں سے اپنا مطلب حل کرتے تھے اس لیے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت شیث علیہ السلام کے عہد میں فارسی زبان کا وجود نہیں ہوا تھا کیونکہ اس وقت تک کسی بھی زبان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ فارسی زبان پارس ابن پہلو ابن شام ابن نوح علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ ایران پارس کا مسکن تھا اور اسی کے نام سے مشہور ہوا۔ شیخ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ فارسی پارس ابن عاصور ابن یافث ابن نوح علیہ السلام کی طرف منسوب ہے نیز فارسی زبان کی سات قسمیں بھی بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ پارسی۔ ۲۔ دری۔ ۳۔ ہروی۔ ۴۔ پہلوی۔ ۵۔ سکری۔ ۶۔ زاولی ۷۔ سغدی۔

تحفۃ القوانین میں فارسی کی ابتدا کے متعلق ملتا ہے کہ

"اول[۱] زبان فارسی پارس بن پہلو بن شام بن نوح علی نبینا و علیہ السلام ظاہر کرد و در مبنی کہ مسکنش بود بہ نام او مسمی و مشہور گشت و در زبان قدیم تمام ایران را پارس می گفتند و حدش طولاً از جیحون تا فرات و عرضاً از باب الابواب تا ساحل عمان است و مجرد ایام ہر ولایتی مسمی باسمی کردید۔ چنانچہ شرق ملک اصطخر را خراسان نامیدند چہ اکہ خراسان بعرس قدیم بمعنی شرق است۔ وہم چنیں

[۱] تحفۃ القوانین ص ۲و۳

مغرب اصطخر را اصفہان گفتند زیراکہ بمعنی مغرب است و شیخ ابن حجر عسقلانی در فتح الباری گوید کہ پارسی منسوب بہ پارس ابن عاصور بن یافث بن نوح علیہ السلام است علی نبینا و علیہ السلام"۔

فارسی زبان کو عربی کے بعد بہترین زبان کہا جاتا ہے اور فارسی کے اقسام اور ان کے بولنے والوں کے بارے میں ملتا ہے کہ

"در برہان[۱] قاطع نوشتہ بعد زبان عرب بہترین زبانہا فارسی است و آں بر ہفت قسم است۔ ہروی و سکری و زاولی و سغدی و ایں ہر چہار متروک اند کہ خبری ازاں نتواں نوشت و دری و پہلوی و پارسی کہ متداول و مستعمل اہل محاورہ و تکلم است دری زبان ملائکہ فلک چہارم است کہ ساکنان کوہ از غایت بر یدبان القاء یافتند و در آں نقصانی نباشد۔ مثلاً شکم را اشکم و برو را ابرو و سپر را اسپر بنیز ہم گویند و کلام فردوسی بیشتر زبان دری است و پہلوی زبان ساکنان شہر پہلو است کہ بنام پہلو بن شام و پارسی زبان اہل پارس است کہ بنام پارس بن پہلو است شہر اصطخر معمورہ کیومرث است و ایں افصح جمیع زبانہا است و آں را پارسا نیز گویند۔ شمس الدین حافظ شیرازی علیہ الرحمہ فرماید کہ مطرب حریفاں ایں پارسی سراید در رقص حالت آرد پیران پارسا را لیکن پارسا بمعنی پارسا آنست است"۔

ان تمام باتوں کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فارسی زبان حضرت نوح علیہ السلام کے عہد میں یا ان کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد وجود میں آ گئی تھی۔ ہر زبان زمانے اور ماحول کے لحاظ سے ترقی کرتی ہے۔ یہی حال فارسی کا رہا۔ اسی وجہ سے مورخین

[۱] تحفۃ القوانین ص ۲-۳

نے فارسی کی سات قسمیں بیان کیں۔ ابتدا میں بولی جانے والی زبان اور اس کے بعد بولی جانے والی زبان میں کافی فرق ہوگیا ہوگا اور اسی طرح اس کے بعد کے زمانوں میں فارسی کن کن حالات سے گزری اور اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں اس کا مکمل طور پر پتہ نہیں چلتا پھر بھی کچھ حد تک معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں کافی تبدیلیاں ہوئیں اور ہیخی[1] خط اس کے بعد اوستائی اور پھر پہلوی طرز تحریر میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ اسی سے ثابت ہوجاتا ہے کہ زبان میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

فارسی ادب کا ارتقاء

ساسانی دور سے فارسی ادب کے آغاز و ارتقاء[2] کا پتہ چلتا ہے۔ اس دور میں فلسفہ وحکمت اور اجتماعی علوم کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا اور یہی وہ زریں دور تھا جس میں فارسی[3] ایران کی سرکاری زبان بنی جس کا سرکاری اداروں اور زردشتی مذہب کے حلقوں میں رواج تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ نسطوری کلیساؤں میں سریانی زبان بولی جاتی تھی۔ عرب حملہ اور ساسانی حکومت کے زوال سے فارسی کو نقصان تو ضرور پہنچا لیکن ان کی ادبی زندگی پر اس کا کوئی نمایاں اثر نہیں ہوا۔ اس لیے کہ اسی کے بعد متعدد ادبی و تاریخی کتابیں لکھی گئیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی زبان زندہ رہی۔ متعدد زبانیں دیگر زبانوں کا اثر قبول کرتی ہیں۔ اسی طرح فارسی نے بھی دوسری زبانوں کا اثر قبول کیا۔ عربوں کے حملے کے بعد فارسی عربی سے بہت متاثر نظر آتی ہے اور

---

[1] تاریخ ادبیات ایران۔ از ڈاکٹر رضا زادہ شفق ص۳

[2] تاریخ ادبیات ایران از رضا زادہ شفق ص۳۸

[3] فارسی ادب کے ارتقاء کی مختصر تاریخ ص۷

بعد میں ہندی[1] نے بھی فارسی زبان پر اپنا اثر ڈالا جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ بہت سے ایسے ثبوت ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی ہندی سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی جیسا کو محمود[2] شیرانی نے اس طرح لکھا ہے کہ:۔

"خود فارسی زبان میں ہمیں ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اسی عہد میں فارسی پر ہندی کا اثرات کی گواہی دیتے ہیں مثلاً لفظ تبت" جو "بودہ" کی بگڑی شکل ہے۔ یا کوتوال جو ٹھیٹ ہندی یعنی کوٹ والا بھی مالک قلعہ تھا۔ یہ لفظ شاہنامہ فردوسی میں بھی موجود ہے چنانچہ

چو آگاہ شد کوتوال حصار — بر آویخت با رستم نام دار

صاحب شرف نامہ کہتے ہیں

"و از شیخ واحدی محقق است کہ لفظ ہندی است کہ بخراسان وفارس مشہور شدہ"

۲۱ھ میں عربوں کی وہ مشہور جنگ جو "نہاوند" کے مقام پر ہوئی اور فتح الفتوح کے نام سے مشہور ہوئی اس میں ساسانی دور کے آخری تاجدار یزدگرد سوم نے شکست کا منھ دیکھا اور عربوں کا ایران پر تسلط ہوگیا اور تقریباً دو سو سال تک عرب ایران پر حکومت کرتے رہے۔ اس دوران عربی کافی حد تک رواج پائی اور ایرانیوں نے عربی سیکھنے پر بہت توجہ دی اور پہلوی (فارسی) کا رواج کم ہوتا

---

[1] ہندی کا مطلب دیوناگری زبان نہیں ہے بلکہ پہلے ہندی کا بھی اردو (ہندوستانی زبان) استعمال ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے میر حسن دہلوی نے شعرائے اردو کے تذکرے کا نام تذکرہ شعرائے ہندی رکھا ہے۔

[2] پنجاب میں اردو از محمود شیرانی ص۲۹

گیا اور ۲۰۵ھ میں جب طاہر ذوالیمین کو خراسان کی حکومت ملی تو فارسی کی زندگی از سرِ نو شروع ہوئی۔ طاہری دور[1] ۲۰۵ھ سے شروع ہو کر ۲۵۹ھ میں ختم ہوا۔ اس دور کا مشہور شاعر حنظلہ بادغیسی نیشاپور میں رہتا تھا اس کا یہ قطعہ بہت مشہور ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ احمد خجستانی نے جب حنظلہ کا دیوان دیکھا تو اس قطعہ نے اس کو بہت متاثر کیا اور اس کے عزائم میں وسعت پیدا ہوئی اور وہ درجۂ امارت تک پہونچ گیا ؎

مہتری گر بکام شیر دراست | شو خطر کن ز کام شیر بجوئی
یا بزرگی و عز و نعمت و جاہ | یا چو مردانت مرگ رو یاری

طاہری دور کے بعد صفاری دور چونکہ یعقوب[2] بن لیث صفار جو صفاری حکومت کا بانی کہا جاتا ہے ادب سے لگاؤ رکھتا تھا اس لیے اس دور میں ادب ترقی کرنے لگا۔ صفاری دربار کے شعرا میں فیروز مشرقی، ابو سلیک گرگانی کے علاوہ یعقوب بن لیث کا دبیر محمد بن وصیف بھی شاعری کرتا تھا۔ اس نے یعقوب کی مدح میں قصائد بھی کہے ہیں۔ ایک قصیدہ کا مطلع یہ ہے ؏

ای امیری کہ امیران جہاں خاص و عام
بندہ و چاکر و مولای و سگ بندہ غلام

اس کے بعد سامانی دور میں فارسی ادبیات کا عروج ہوا اور اس دور میں سمرقند کو بھی علم و ادب میں شہرت ملی۔ اس دور میں فارسی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں اور فارسی شعراء کی کثرت بھی رہی۔ اسی دور میں رودکی (جسے

---

[1] تاریخ ادبیات ایران از ڈاکٹر رضا زادہ شفق ص۱۵
[2] تاریخ سیستان بحوالہ خصوصی تاریخ ادبیات ایران از رضا زادہ شفق ص۵۳

فارسی شاعری کا آدم کہا جاتا ہے[1]) بھی تھا۔ سامانی دور کے بعد غزنوی دور ہے جس میں فارسی ہندوستان بھی آئی اور پھلی پھولی بھی۔ غزنوی دور کا ہم قدرے تفصیل سے اپنے اگلے صفحات میں تذکرہ کر رہے ہیں۔

---

[1] شعر العجم جلد پنجم از مولانا شبلی نعمانی ص۳۴

باب دوم

ہندوستان اور فارسی

ہندوستان میں فارسی کی آمد

محمود غزنوی نے ۱۰۰۱ء میں[1] راجہ جے پال کے دارالحکومت پر حملہ کیا۔ اس وقت وہ سارے پنجاب کا حکمراں تھا۔ اس میں محمود کو کامیابی ملی اس کے علاوہ اس نے ہندوستان پر کئی حملے کئے۔ محمود سے پہلے ہندوستان پر محمد ابن قاسم کا حملہ جو آٹھویں صدی کے اوائل میں ہوا تھا اس میں ہندوستان عربی نفوذ کے تحت آگیا تھا لیکن تاریخ میں اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ ہندوستان میں فارسی زبان کبھی رواج پا گئی تھی۔ فارسی محمود غزنوی[2] کے ساتھ ہی ہندوستان آئی اور اس کو کھلنے پھولنے کے مواقع بھی ملے جیسا کہ ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھا ہے کہ

"محمود غزنوی نے ہندوستان پر مسلسل حملے شروع کئے تو ایرانی تہذیب و

---

[1] بھارت ورش کا اتہاس ص۱۷۲

[2] فارسی اور ہندوستان ص۹

تمدن اور ایرانی زبان وادب کے پھیلنے کے مواقع زیادہ ہو گئے۔ اہل ایران کو ہندوستان کے مسائل سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ابوریحان بیرونی کی کتاب تحقیق ماللھند اور زین الدین گردیزی کی کتاب زین الاخبار کے بعض اجزاء سے اس بات کا بخوبی ثبوت فراہم ہوتا ہے[1]۔"

محمود غزنوی ۹۷۱ء[2] میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنی سلطنت کو کافی وسیع کیا۔ اس کے باپ امیر سبکتگین نے اپنے مرنے سے پہلے اپنی سلطنت دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دی تھی۔ محمود جو بڑا بیٹا تھا اس کو خراسان و ہرات کی حکومت کا مالک بنایا اور چھوٹے بیٹے اسماعیل کو غزنی کی حکومت دی لیکن محمود اپنی حکومت کو وسعت دینا چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنے بھائی اسماعیل سے جنگ کی اور اس کو شکست دے کر قید کر لیا[3] اور ۹۹۸ء میں غزنی پر قبضہ کر لیا۔ اس نے اپنی فتوحات سے حدود حکومت بہت وسیع کر لیے تھے۔ اس کی فتوحات کی خبروں سے متاثر ہو کر بغداد[4] کے خلیفہ قادر باللہ نے یمین الدولہ اور امین الملت کے خطابات دیے اور اس کی آزاد حکومت تسلیم کر لی جس کی وجہ سے اس کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔ ایشوری پرشاد[5] کے الفاظ میں۔

"جس وقت محمود گدی پر بیٹھا غزنوی حکومت میں افغانستان، خراسان اور

۱ فارسی اور ہندوستان ص۲

۲ تاریخ ہند جلد اول ص۲۴۵

۳ تاریخ ہند جلد اول ص۲۴۸

۴ تاریخ ہند جلد اول ص۲۴۸

۵ بھارت ورش کا اتہاس ص۱۷۱

فارس صوبے کے پورے علاقے شامل تھے۔ محمود نے اپنی فتوحات سے اس کو کافی بڑھایا۔ ایک ہی سال بعد اس نے سیستان کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اس کی فتوحات کا حال سن کر خلیفہ نے اسے یمین الدولہ کا خطاب دیا جس سے اس کا کافی حوصلہ بڑھ گیا اور اس نے ہندوستان پر ہر سال حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ ان حملوں کو جہاد اور پاکیزہ لڑائی سمجھتا تھا۔ ۱۰۰۱ء سے ۱۰۲۶ء تک اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے اور یہاں سے کافی دولت لوٹ کر لے گیا" (ہندی کا سے ترجمہ)

محمود نے اگرچہ اپنے حدود حکومت بڑھانے پر کافی توجہ دی پھر بھی وہ فارسی ادبیات سے غافل نہیں رہا۔ اس کے دربار میں بہت سے ادبا و شعراء و علماء موجود رہتے تھے جن کی وہ سرپرستی کرتا تھا۔ البیرونی جو علم نجوم و فلسفہ اور ریاضیات و سنسکرت کا عالم ہونے کے ساتھ ساتھ مورخ بھی تھا۔ وہ بھی اس کے دربار سے وابستہ تھا۔ وہ محمود کے ساتھ ہندوستان بھی آیا اس نے ہندوستان میں رہ کر فلسفہ سنسکرت، علم نجوم اور دیگر علوم بھی حاصل کیے۔ یہ بھی ہندوستان کی خصوصیت ہے کہ ابوریحان البیرونی جیسے بزرگ عالم نے ہندوستان میں تعلیم حاصل کی بلکہ ہم تو یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ وہ اگر ہندوستان میں رہ کر تعلیم حاصل نہ کرتا تو وہ ایک عالم ہوتا لیکن بڑا عالم نہ ہوتا۔ ایشوری پرشاد[1] نے لکھا ہے کہ

"البیرونی ایک صاحب علم آدمی تھا جو محمود غزنوی کے عہد میں ہندوستان آیا اور یہاں کچھ عرصہ رہ کر اس نے ہندوستانی فلسفہ، نجوم اور شاید دوسرے علوم کا مطالعہ کیا۔ اس کو سنسکرت سیکھنے میں کافی رکاوٹ پڑی اسی لیے اس نے

۱ بھارت ورش کا اتہاس ص۱۷۷

لکھا ہے کہ ہندو علماء بیرونی افراد کو اپنی تعلیم سکھانے میں ہچکچاتے ہیں۔"

(ہندی سے ترجمہ)

محمود کے دربار میں البیرونی کے علاوہ عنصری، فرخی اور فردوسی جیسے بڑے شعراء بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محمود[1] خود بھی شعر کہتا تھا اور اس کو فارسی نثر پر بھی عبور حاصل تھا۔ محمود اگرچہ ایک سُنی مسلمان تھا اور وہ اپنی فتوحات کو مذہبی عنوان دے کر دینِ اسلام کی تبلیغ میں سرگرم رہتا تھا اور ہندوستان پر زیادہ حملے ہندوؤں کی دشمنی اور اسلام کی تبلیغ کے تحت ہوئے اور اس نے ہندوستانی مندروں کو لوٹا۔ اس کو شیعوں کا دشمن بھی کہا جاتا ہے۔ ۱۰۰۵ء میں ملتان پر جو حملہ کیا وہ شیعہ دشمنی کا نتیجہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس وقت ملتان کا حکمراں ابوالفتح داؤد قرامطی تھا اور قرامطی کے بارے میں نواب[2] علی قریشی نے لکھا ہے کہ:-

"قرامطی شیعوں کا ایک طاقتور گروہ تھا جس کو ۸۹۱ء میں احمد نامی ایک شخص نے قائم کیا۔ قرامطہ کے لفظی معنی پوشیدہ خط و کتابت کرنے کے ہیں۔ قرامطی گروہ نے بہت پوشیدگی سے اپنی طاقت بڑھائی اور اس نے بغداد کے خلیفہ کی طاقت توڑنے کے لیے مصر میں بنی فاطمہ کی خلافت قائم ہونے میں مدد کی۔ قرامطی لوگ بغداد کے عباسی خلفاء کے دشمن تھے۔ ملتان کا حاکم ابوالفتح داؤد قرامطی تھا۔ محمود غزنوی سُنی تھا اور بغداد کے خلیفہ کا وفادار تھا اسی لیے داؤد کا سخت دشمن تھا۔"

۱۔ تاریخ ادبیات ایران از ڈاکٹر رضا زادہ شفق ص۹۰
۲۔ تاریخ ہند از نواب علی قریشی ص۲۴۹

رضا زادہ شفق[1] نے اس کی ہندو اور شیعہ دشمنی پر اس طرح روشنی ڈالی ہے "اس نے ہندوستان کے مندروں سے خزانے حاصل کیے اور سومناتھ کے مندر سے سب سے بڑا خزانہ حاصل کیا۔ محمود نے مذہب سنت کی بڑی سرپرستی کی اور اس کے بارے میں اس نے غلو سے کام لیا۔ دینِ اسلام کے دوسرے فرقوں خاص کر اسماعیلیہ فرقے کے پیروؤں کو اس نے سخت سزائیں دیں۔"

پھر بھی محمود تمام سیاسی فتوحات اور مذہبی[2] اختلافات کے ساتھ ساتھ فارسی ادبیات سے دلچسپی رکھتا تھا اس کے دربار میں بڑے بڑے شعراء تھے اور ابوالقاسم فردوسی جیسا شاعر جو رزمیہ مثنوی نگاری میں بے مثال ہے محمود کی خوش قسمتی سے اس کے دربار میں موجود تھا اور شاہنامہ محمود ہی کی فرمائش پر لکھا تھا۔

ابوالقاسم حسن فردوسی کا شاہنامہ ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے اس میں شاعر نے جنگ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے جیسے جنگ سامنے ہو رہی ہو۔ اس میں جابجا تاریخی اشارے اور محاورات کا موقع اور محل کے اعتبار سے مناسب استعمال نیز حکایات کا دلکش پیرایے میں بیان ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا کے بزرگ ترین شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شاہنامے کے چند اشعار نمونے کے طور پر درج ہیں۔

بنام خداوند جان و خرد — کزیں برتر اندیشہ برنگذرد
سپاہم زیزداں کہ او داد زور — بلند اختر و بخش کیواں و ہور

۱۔ تاریخ ادبیات ایران از رضا زادہ شفق ص۹۰
۲۔ کوئی بھی حکمراں ہو وہ اپنا سیاسی مفاد چاہتا ہے لیکن اس کے سیاسی مفادات جو مذہبی نوعیت کے ہو سکتے ہیں ان کو اسی رنگ میں رنگ دیا جاتا ہے۔

مگر او دہد یاد ماں بندگی — نماید بزرگی و دارندگی

نباید نہادن دل اندر فریب — کہ پیش فرازندہ آید نشیب

مراگفت کز من چہ آید ہمی — کہ جانت سخن برگزاید ہمی

ازیں نامہ از نامداران شہر — علی دیلم بودلف راست بہر

فریدوں و فرخ فرشتہ نبود — بمشک و عنبر سرشتہ نبود

بدیبائی، روکا بیا راستند — سرزلف برگل بہ پیراستند

عہد غزنوی میں فارسی ادب

فارسی محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئی اور محمود نے فارسی ادبیات کی خدمت بھی کی۔ اس کے علاوہ دیگر غزنوی سلاطین نے بھی فارسی ادبیات کی خدمت کی اور ادب سے دلچسپی دکھائی۔ سلاطین کی ادب پروری کی بدولت ہندوستان کے اندر غزنوی دور ہی میں علماء اور شعراء پیدا ہوئے۔ اگر ہم غزنوی عہد کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہندوستانی شعراء میں فارسی کے دو بڑے شاعر ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان سرفہرست نظر آتے ہیں نیز فارسی کے تصوف کے موضوع پر اولین کتاب کا مصنف ابوالحسن ہجویری بھی ہمیں ہندوستان ہی میں نظر آتا ہے۔ یوں تو غزنوی عہد میں کئی اکابر شعراء کے نام ملتے ہیں لیکن ہمارا مقصد بیان ہندوستان میں فارسی کی تدریجی اشاعت ہے اس لیے ہم فارسی کے ایرانی شعراء و علماء کے حالات اور کارناموں سے قطع نظر کرکے ہوئے صرف ہندوستانی یا ہندوستان میں موجود ایرانی نژاد اکابر شعراء و علماء کے حالات اور کارناموں کا مختصر جائزہ پیش کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے اکابر شعراء میں مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج رونی کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔ اور علماء میں صوفی بزرگ ابوالحسن علی ہجویری کا نام نمایاں ہے۔

ابوالفرج بن مسعود کی ولادت لاہور[1] کے قریب رونہ گاؤں میں ہوئی۔ وہ ایک اچھا قصیدہ نگار تھا۔ اس کی طبیعت میں بے پناہ لطافت تھی کئی شعراء نے اس کی پیروی کی ہے اور اس کی تعریف میں اشعار بھی کہے ہیں۔ مشہور شاعر انوری نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے

[2] در متانت خیل اقبالت چو شعر بوالفرج
وز غذوبت مشرب عیشت چو نظم فرخی

رونی اپنے قصائد کو تغزل سے شروع کرتا ہے۔

نوروز جواں کرد بدل پیر جواں را
ایام جوانی است زمیں را و زماں را
ہر سال دریں فصل برآرد فلک از خاک
چوں طبع جواناں جہاندرست جہاں را

رونی کو منظر کشی پر بھی قدرت حاصل ہے اور وہ مناظر قدرت کی عکاسی نہایت لطیف پیرائے میں اور حسین انداز میں کرتا ہے۔ اس کو قصائد کے ساتھ رباعی گوئی میں بھی مہارت حاصل ہے۔ اس کی رباعیاں عمر خیام کی طرح فلسفیانہ نظر آتی ہیں

[3] تا یک نفس از حیات باقی است مرا
وز سرہوس شراب و ساقی است مرا
کاری کہ من اختیار کردم ایں بود
باقی ہمہ کار اتفاقی است مرا

[1] و [2] تاریخ ادبیات ایران ص ۲۴۴
[3] نشتر عشق "صدرک"

ابوالحسن علی ہجویری عہدِ غزنوی کے صوفی بزرگ تھے اور انھوں نے تصوف پر کتاب قیام لاہور کے دوران لکھی جس کا نام کشف المحجوب ہے۔ یوں تو انھوں نے کئی کتابیں لکھیں لیکن کشف المحجوب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ فارسی زبان میں تصوف کی پہلی کتاب ہے اور ہندوستان میں تالیف ہوئی۔ اس کے علاوہ وہ شاعری میں بھی ماہر تھے اور کہتے ہیں کہ:-

[1] اے علی تو فرخی در شہر و کو   وہ زعشق خویشتن ہر سو صلہ

مسعود سعد سلمان[ع] بھی ایک بڑا شاعر تھا جن کی ولادت لاہور[2] میں ہوئی وہ سیف الدین محمود کے ساتھ قید خانے میں بھی رہا۔ اور قید خانے کی زندگی کا اپنے اشعار میں اظہار بھی کیا ہے۔ دوران حبس[3] قرآن مجید حفظ کیا جس کی بنا پر وہ قید خانہ میں بھی ایک طرح کی خوشی محسوس کرتا ہے۔

نہ تن من زبند رنجور است   نہ دل من ز بند ہراساں است
تکیہ بر حسن عہد بوالفتح است   شادی از حفظ نظم قرآں است

وہ ایک فارسی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا نثر نگار بھی تھا جس کو وہ[4] ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

بنظم و نثر کسی را اگر افتخار سزا است
مرا سزا است کہ امروز نظم و نثر مرا است

---

[1] خم خانہ تصوف ص ۲۳
[ع] مصنف خزانہ عامرہ نے "سلیمان" لکھا ہے
[2] تاریخ ادبیات ایران ص ۱۹۰
[3] خزانہ عامرہ ص ۱۵ و ۱۴۱
[4] تاریخ ادبیات ایران ص ۱۹۶

مسعود سعد سلمان فارسی نظم و نثر کا ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ اردو[1] اور عربی کا بھی شاعر تھا اور عربی و فارسی و اردو تینوں زبانوں میں صاحب دیوان شاعر تھا۔

ہندوستان میں فارسی ادب کا عروج

مغل دور میں ہندوستان میں فارسی ادب کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے۔ مغل عہد حکومت میں بہت سے بیرونی شعرا ہندوستان آئے اور ہندوستان میں تصنیف شدہ بیشتر فارسی کتب عہد مغل کی رہین منت ہیں۔ اس عہد میں کتابوں کی تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ تراجم کا کام بھی ہوا۔ عربی و سنسکرت کتابوں کے فارسی میں ترجمے ہوئے۔ بابر کے درباری شعرا[2] میں شیخ ابوالوجد فارخی، سلطان محمد کوسہ، سرخ و داعی اور شیخ جمالی وغیرہ بابر کی علم نوازی کا حال سن کر ہندوستان آئے۔ مغل شہنشاہوں نے علم و ادب کی ترویج و اشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔ سیم و زر کی کمی نہیں تھی۔ ہندوستان جنت نشان بنا ہوا تھا۔ شعرا و ادبا کھنچ کھنچ کر یہاں آرہے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ قاسم کاہی جیسا شاعر جس کا کہنا تھا کہ

[3] کاہی تو بلبل چمن آرائے کابلی   زاغ و زغن نہ ای کہ بہ ہندوستاں شوی

وہ بھی ہندوستان[4] آیا اور ہمایوں کے دربار سے وابستہ ہوا۔

---

[1] خزانہ عامرہ ص ۱۵
[2] بزم تیموریہ ص ۲۳
[3] تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص
[4] بزم تیموریہ ص ۳۰

ہندوستان کی فارسی ادبیات کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ تصوف کی اولین کتاب کے بعد فارسی تذکرہ نگاری کی پہلی کتاب بھی ہندوستان میں لکھی گئی۔ فارسی کا نیہ تذکرہ محمد عوفی نے لباب الالباب[1] کے نام سے لکھا۔

مغل عہد میں اکبر کا زمانہ فارسی ادب کے لیے عہدِ زرّیں کہا جا سکتا ہے۔ اس عہد میں ہندوستان فارسی شعراء سے بھرا ہوا تھا جس میں بیرونی شعراء کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ لچھمی نرائن شفیق کی شامِ غریباں میں مہاجر شعراء میں عہدِ اکبر کے شعراء کی تعداد زیادہ ہے۔ بزمِ تیموریہ کے مصنف صباح الدین عبد الرحمن نے اکبر کے عہد کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے۔

[2] "اکبر کی زرپاشیاں سن کر ہر جگہ سے شعراء ہندوستان میں امنڈ آئے تھے۔ مُلا بدایونی نے اس عہد کے ایک سو چھ شعراء کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ اکبر نہ صرف ان پر سیم و زر کی بارش کرتا تھا بلکہ ان کی ہمت افزائی اور سخن کے معیار کو بلند کرنے کی خاطر ملک الشعراء کا خاص عہدہ قائم کیا۔"

فارسی شاعری کو ہندوستان نے نیا لب و لہجہ عطا کیا جو کہ "سبک ہندی" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی خصوصیت[3] یہ ہے کہ اس میں دقیق افکار نئے اور مشکل مضامین کو عام فہم اور سادہ زبان میں بیان کیا جاتا ہے۔ ایرانی شعراء ہندوستان کی ادب نوازی سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنے

[1] تاریخ ادبیات ایران ص ۴۴۳

[2] بزم تیموریہ ص ۹۷

[3] فارسی ادب کی مختصر تاریخ ص ۵۸

اشعار کے ذریعہ ہندوستان کی مدح سرائی بھی کی۔ علی قلی سلیم نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ

[1] نیست در ایراں زمین سامان تحصیل کمال
تا نیامد سوی ہندوستاں حنا رنگیں نہ شد

ہندوستان میں کبھی فارسی کے شعراء پیدا ہوئے اور خصوصیت سے غیر مسلمین نے بھی فارسی میں دلچسپی لی جس کا ہم اگلے باب میں تذکرہ کر رہے ہیں۔

[1] فارسی ادب کی مختصر تاریخ ص ۸۵

باب سوم

فارسی اور ہندو

ہندوؤں کی فارسی میں دلچسپی

زبان و ادب کسی خاص فرد یا فرقہ کی جاگیر نہیں۔ اس میں سب کا برابر کا حق ہے بشرطیکہ ظرف میں صلاحیت ہو۔ بعض لوگ زبان کی نسبت فرقوں کی جانب اس کے بولنے والوں کی وجہ سے دے دیتے ہیں۔ فارسی چونکہ ایران کی زبان ہے جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے اس لیے شبہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں ہندوؤں کا حصہ نہیں ہوگا یا اگر ہوگا تو جزوی طور پر ہوگا لیکن ہمیں فارسی ادبیات میں ہندوؤں کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ فارسی ہندوستان میں غزنوی عہد میں آئی اور مغلیہ عہد میں اس کو اس سرزمین پر انتہائی عروج حاصل ہوا۔ اس کی وجہ مغل سلاطین کی فارسی ادبیات سے دلچسپی تھی اور مغل عہد میں سرکاری زبان بھی فارسی ہی تھی۔ اس لیے لوگوں کی دلچسپی بھی بڑھی خصوصاً ہندوؤں نے فارسی سے دلچسپی لی۔

مغل حکمراں اپنی حکومت کے استحکام کے لیے تمام لوگوں کو خوش رکھنا چاہتے

تھے خصوصی طور پر ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے دے کر اپنا وفادار بنایا جاتا تھا۔
ایشوری پرشاد[1] مغل عہد کے ہندوؤں کی فارسی کے بارے میں دلچسپی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"سلطنت میں بڑے بڑے عہدے پانے کے خواہشمند ہندوؤں نے فارسی خوب پڑھی"۔ (ہندی سے ترجمہ)

اکبر کے دربار میں منوہر توسنی تھا جو سانبھر کے راجہ لون کرن کا بیٹا تھا۔ اس کو اکبر بادشاہ نے "مرزا منوہر" کا خطاب دیا تھا مگر وہ اپنے کو "محمد منوہر" لکھتا تھا۔ نریندر بہادر سریواستو[2] لکھتے ہیں کہ:۔

"اکبر کے زمانے میں ہندو فارسی کی طرف متوجہ ہوئے تھے اس زمانے سے لے کر انگریزی حکومت کے خاتمے تک ہندوستان میں فارسی کا خوب دور دورہ رہا"۔

اس کے بعد دیگر مغلیہ سلاطین کے درباروں میں ہندو علماء و شعراء کی اچھی خاصی تعداد دکھائی دیتی تھی۔ انشاء پردازی اور شاعری ان دو شعبوں میں ہندوؤں کی بڑی تعداد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر علوم میں بھی ہندوؤں کا حصہ ہے مثلاً تاریخ نویسی، لغت اور تذکرہ نگاری میں بھی ہندو شامل نظر آتے ہیں۔ تاریخی کتابوں میں کیول رام کی تذکرۃ الامراء، راجہ بھیم سین کی تاریخ دلگشا، درگا پرشاد کی گلستان ہند، نول رائے کی تاریخ احمد خانی، منا رام کی ماثر نظامی، کلیان

۱؎ بھارت ورش کا اتہاس ص ۴۳۱

۲؎ بزم تیموریہ ص ۱۰۷

۳؎ نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان ص ۵۲

سنگھ کی واردات قاسمی، بندرابن مل کی لب التواریخ اور لچھمی نرائن شفیق کی ماثر آصفی، ماثر حیدری اور بساط الغنائم کے نام سے اہمیت کے حامل ہیں۔

ہندوؤں کی تصنیف کردہ لغات میں لالہ ٹیک چند بہار کی بہار عجم کو اہمیت و مقبولیت حاصل ہے۔ تذکرہ نگاری میں بندرابن داس خوشگو کا سفینۂ خوشگو، دیبی پرشاد بشاش کا تذکرہ شعرائے ہنود، درگا داس عشرت کا سفینۂ عشرت، بھگوان داس ہندی کا سفینۂ ہندی، کشن چند اخلاص کا ہمیشہ بہار اور لچھمی نرائن شفیق کی شام غریباں، گل رعنا وغیرہ شعرائے فارسی کے حالات زندگی اور نمونہ ہائے کلام فراہم کرنے میں پیش پیش رہیا۔

فن انشاء میں ہندوؤں نے کمال حاصل کر لیا تھا اور چونکہ انشاء نگاری میں خوش خطی کا بھی خیال رکھا جاتا تھا اس لیے ہندوؤں میں اچھے اچھے خوش نویس بھی ہوئے آج بھی ہندوؤں کی فارسی خوشنویسی کے نمونے کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ ہندو انشاء پردازوں میں منشی مادھو رام، منشی لال چند، منشی چندر بھان برہمن، منشی لچھمی نرائن اور منشی خیالی رام کی انشاء پردازی کو فارسی ادب میں اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ لاتعداد ہندو انشاء پردازوں کا پتہ چلتا ہے بلکہ تاریخی کتابوں میں تو یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ عہد مغلیہ میں مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو انشاء پرداز زیادہ تھے۔ مغل سلاطین کے درباروں میں انشاء پردازی (منشی) کے عہدہ پر ہندوؤں کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے اور یہ خصوصیت عہد مغلیہ تک محدود رہ گئی اس کے بعد اس میں بہت کمی دکھائی دینے لگی اور اب تو ہندوؤں میں فارسی انشاء پرداز بہت تلاش و جستجو پر شاید ہی کوئی مل سکے۔

شعر و شاعری میں بھی ہمیں بہت سے ہندو شعراء کے نام نمایاں ملتے ہیں جن میں بندرابن داس خوشگو، آنند رام مخلص، چندر بھان برہمن، ٹیک چند بہار،

سرب سنگھ دیوانہ، لچھمی نرائن شفیق، رتن سنگھ زخمی، راجہ الفت رائے الفت اور بھگوان داس بسمل شامل ہیں۔

مذکورہ جائزے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ فارسی ادب کی تاریخ بغیر ہندوؤں کے نامکمل رہ جائے گی۔ اس کے باوجود ایرانی ادبیات کے مصنفین نے ہندوستان کے فارسی ادباء و شعراء کا تذکرہ یا تو کیا ہی نہیں یا بہت مختصر کیا ہے۔ اگرچہ یہ ادبی تعصب خود فارسی ادب کے لیے نقصان دہ ہے۔

فارسی کے ہندو شعراء

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ فارسی میں ہندوؤں نے بہت دلچسپی لی اور انشاء پردازی، شعر و شاعری اور تاریخ نویسی غرض کہ ہر صنف ادب کی خدمات کیں۔ اس مختصر مقالے میں تمام شعراء کا تذکرہ کرنا ناممکن ہے اس لیے چند مشہور شعراء کا مختصر تذکرہ اور ان کا نمونۂ کلام پیش کیا جا رہا ہے جس سے ان کی قابلیت اور طرز فکر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

الفت

الفت لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ شاہی دور میں فوج میں ملازم تھے اور فارسی کے شاعر اور انشاء پرداز تھے۔ عربی صرف و نحو سے کافی واقفیت رکھتے تھے نیز مرثیہ گوئی سے خاص لگاؤ تھا اور مرثیہ نگار کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اگرچہ وہ ہندو تھے[1] لیکن ان کا میلان شیعہ فرقے کی طرف تھا اور باقاعدہ تعزیہ داری اور مجلسیں کرتے تھے۔ ۱۲۷۰ھ میں انتقال ہوا۔ نمونۂ کلام پیش خدمت ہے۔

[1] نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی میں یوگدان ص ۱۰۵

السلام ای مدح تو آیات قرآن مبیں
السلام ای ذات پاکت کعبۂ علم و یقیں
السلام ای پایہ ات تاج سر عرش بریں
السلام ای سایہ ات خورشید رب العالمیں
آسمان عز و تمکیں آفتاب داد و دیں

مہبط نور الٰہی مصدر آثار غیب
مخزن سر سلونی مطرح انظار غیب
معدن علم لدنی مشرق انوار غیب
مقصد تنزیل بلغ مظہر اسرار غیب
مطلع یتلوہ شاہد مقطع حبل المتیں

آنند

آنند کھن محمد شاہ[1] کے ملازم "بنگالی داس کے فرزند تھے آبائی وطن کنپل (جو اکبر آباد کے مضافات میں ہے) تھا اپنے والد کی وفات کے بعد وطن کو خیرباد کہا اور متھرا میں سکونت اختیار کی۔ پوتھی رامائن کا سنسکرت سے بھاکھا میں ترجمہ کیا۔ احمد شاہ درانی نے جب متھرا میں قتل و غارت مچائی تو اس میں آنند بھی زخمی ہوئے اور فی البدیہہ یہ شعر کہا۔

ای زخم نصیباں ترا عار ز مرہم
قرباں سر تیغ تو یک زخم دگر ہم

ان کا کلام بہت دلچسپ اور مزیدار ہوتا ہے۔ ایک رباعی پیش کی جا رہی ہے۔

[1] نشتر عشق ص ۸۵

بالیں ہمہ شب ز اشک من تر گردد
بر بستر من برگ گل اخگر گردد
خواب آید و در دیدہ من بیند آب
از غرق شدن ترسد و پس برگردد

برہمن چندر بھان برہمن کا اصل وطن لاہور تھا۔ اس کے بعد اکبرآباد (آگرہ) میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ انشاء پردازی میں کمال حاصل تھا۔ نثر[1] میں انشائے برہمن اور چار چمن ان کی یادگار ہیں۔ داراشکوہ کے دربار میں "منشی" کے عہدہ پر تھے۔ ایک دفعہ داراشکوہ سے کہا گیا کہ چندر بھان[2] شاعری بھی کرتا ہے اس نے کہا کہ جو شعر تمھیں پسند ہو سناؤ۔ برہمن نے یہ شعر پڑھا

مرا دلی ست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

داراشکوہ کو بہت بار خاطر ہوا۔ اس نے کہا کون ہے جو اس شعر کا جواب لائے تو افضل خاں نے شیخ سعدی کا یہ شعر پڑھا

خر عیسیٰ اگر بمکہ برود
چوں بیاید ہنوز خر باشد

برہمن کے اشعار کا نمونہ پیش خدمت ہے

کنم ز سادہ دلی بند دیدہ مژگاں را
بمشت خس نتواں بست راہ طوفاں را

---

[1] نشتر عشق ص ذ ک ق
[2] تذکرہ حسینی ص ۴۰، و نشتر عشق ص ذ ک ق

نگاہ لطف و کرم جانب برہمن بود
عتاب و ناز و ستم آنچہ داشت با ما داشت

بسمل بھگوان داس سریواستو ابسمل لکھنؤ[1] کے رہنے والے تھے۔ عربی فارسی صرف و نحو میں مہارت حاصل کرنے کے بعد شعرائے فارسی کے دواوین کا مطالعہ کیا۔ شعر و شاعری سے بہت لگاؤ تھا اس لیے خود بھی شاعری شروع کر دی اور بسمل تخلص اختیار کیا آخر عمر میں ہندی تخلص اختیار کر لیا تھا اور فارسی شعراء کا ایک تذکرہ "سفینہ ہندی" کے نام سے تحریر کیا۔ ان کی رباعی نمونہ کے طور پہ ملاحظہ ہو۔

وا ہم کہ شد ای دشمن جانم ای آہ
کہ دند ز من بروی دل تو بد خواہ
گر ہست ترا کشتن بسمل منظور
برخیز و بکش تیغ و بزن بسم اللہ

بہار ٹیک چند بہار دہلی کے رہنے والے تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو سے شرف تلمذ[2] حاصل تھا۔ حسینی گردیزی اور میر تقی سے دوستی تھی۔ فارسی میں "بہار عجم" نام کی لغت لکھی جو بہت اہمیت کی حامل ہے اس کے علاوہ بھی انھوں نے فارسی اور اردو میں کتابیں لکھیں۔ شاعری کا بھی شوق تھا۔

خوشدل امر سنگھ خوشدل کے اجداد کٹرہ (ضلع الہ آباد) کے رہنے والے تھے لیکن خوشدل کی پیدائش

---

[1] نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان ص ۱۰۶
[2] " " " ص ۵۰

الہ آباد میں ہوئی[1]۔ شعر و شاعری سے شوق تھا۔ عربی و فارسی میں مہارت حاصل تھی۔ پانچ ہزار اشعار کا دیوان یادگار چھوڑا۔ خوشدل کے اشعار ملاحظہ ہوں

دادم دل خود آں لب معجز کلام را
گفتم دعا مسیح علیہ السلام را

نمی دانم چہ تاثیر است در عالم نگاہیش را
پری در شیشہ و دیوانہ در ویرانہ می رقصد

ببیں خوشدل بہ محفل چشم ساقی می کند کاری
صراحی رقصد و دل رقصد و پیمانہ می رقصد

دانش لالہ سوبھا رام دانش لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ راجہ[2] شتاب رائے کے عہد صوبیداری میں بہار چلے گئے اور راجہ کے ملازمین میں شامل ہو گئے یہ اشعار ان کی جولانیٔ طبع کا نتیجہ ہیں۔

ابروش با حسن سبز امروز یکساں دیدہ ام
تیغ جوہر دار را در سبزہ پنہاں دیدہ ام
نیست لازم یک سر مو شکوہ از زلف بتاں
الغرض دیدم دانش از بخت پریشاں دیدہ ام

دیوانہ سرب سنگھ دیوانہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ان کے چچا راجہ[3] رام نرائن، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں "دیوان" کے عہدہ پر

---

[1] نشتر عشق ۵۰۱ ر
[2] نشتر عشق ج ۳۰۰ ر
[3] نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان ص ۱۲۲

فائز تھے۔ کمسنی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ اردو و فارسی دونوں میں مشق سخن کی۔ اور مرزا فاخر لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ سنہ ۱۲۱۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ انتخاب کلام درج ہے۔

الٰہی نشہ ذوق محبت دہ کلامم را
لبالب از شراب شوق وحدت ساز جامم را
بحکم عشق توشیہ خواندم تمام ایں دیوان
خداوندا بکن مخصوص خاصان بفیض عامم را
چوں مرغ معنی وحشی بدام طبع می افتد
عطا فرما بہ پرواز شہرت صید دامم را
تخلص کردہ ام دیوانہ من از جذبۂ عشقت
بفضل خود بگیر داں شہرۂ آفاق نامم را

سبقت سکھ راج سبقت لکھنوی[1] صرف و نحو، منطق، علم معانی و بیان ریاضی اور طب کے علوم سے واقفیت رکھتے تھے۔ شاعری سے شوق تھا۔ سید حسین علی خاں کے ساتھ معارک دکن میں شریک تھے۔ فردوسی کے شاہنامہ کی طرز پر اس جنگ کا حال تقریباً سات سو اشعار میں نظم کیا اور حسین علی خاں کی خدمت میں پیش کیا۔ ان کے اشعار کا نمونہ پیش خدمت ہے۔

چو نقش پا بسر کوی انتظار کسی
نشستہ ام کہ شوم خاک رہگذار کسی

بزم وصل بتاں ہر کہ شمع ساں سبقت
کنیم نقد دل و جاں خود نثار کسی

---

[1] نشتر عشق ص ۸۲۴

مخلص آنند رام مخلص لاہور کے موضع سودہرہ کے رہنے والے تھے شعر گوئی میں ملکہ حاصل تھا۔ سید[1] غلام علی نسیم امروہی نے ان کی شعر گوئی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

آں شہیر سخنوری مخلص
فخر عرفی و انوری مخلص

مخلص اعتماد الدولہ[2] قمر الدین خاں (وکیل محمد شاہ) اور سیف الدولہ کے دربار سے متوسل رہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

ندہم گر الم جدائی ہا
نیر خوبی ہست آشنائی ہا

سیہ مستانہ اشکب من نہ کوئی یار می گردد
چوں آں آبلے کہ وقت شام در گلزار می گردد

خوش نشینان چمن بار سفر می بندند
عندلیبان ہمہ یک جا شدہ فریاد کنید

نبود قابل صحبت مخلص
بگذارید کہ سودا دارد

۱؎ نشتر عشق ص مرخ

۲؎ خزانہ عامرہ ص ۴۲۵

واثق واثق کھتری قوم سے تعلق رکھتے تھے اور مولوی عبداللہ[1] سیالکوٹی کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ ان کے علاوہ رتن سنگھ زخمی[2] بھی مسلمان ہو گئے۔ یہ دونوں فارسی کے نامور شعراء میں شامل ہیں۔

زخمی پنڈت رتن سنگھ نام زخمی تخلص تھا۔ شعر و شاعری سے بہت شوق تھا کمسنی سے شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔ فارسی اور اردو[3] دونوں میں شعر کہتے تھے۔ آخر میں انھوں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ فارسی شاعری کا نمونہ کلام مندرجہ ذیل ہے۔

ای غازہ زنام تو برخ شاہد من را
پیرایہ زوصف تو عروسان سخن را
زخمی فکرت چشم سفید است کہ داری
نسبت بکف پای کسی برگ سمن را

اس کے علاوہ ان کی یہ رباعی بھی ملاحظہ فرمائیں جو آئینہ زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔

درماندہ ام و ہم نفسی نیست مرا
می نالم و فریاد رسی نیست مرا
یارب بہ نظر بحال زارم از رحم
جز مسلم و جز تو کسی نیست مرا

۱؎ نشتر عشق ص فقہ

۲؎ نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان ص ۱۲۹

۳؎ بہار سخن ص ۱۹۸

خوشگو

بندرابن داس خوشگو کا تعلق موضع "بیسواڑہ" سے تھا اور ان کا سلسلۂ نسب راجہ بکرمادتیہ[1] سے ملتا ہے اور مرزا بیدل و سعد اللہ گلشن سے شرف تلمذ تھا۔ فارسی نظم و نثر پر عبور حاصل تھا "سفینۂ خوشگو" فارسی نثر میں ان کی یادگار ہے جس میں انھوں نے فارسی کے ہندو شعراء کا تذکرہ کیا ہے
شعر گوئی میں خوشگو کو کافی شہرت حاصل تھی۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے ؎

ازبیم بداں تا برخ خوب تو بینیم
آئینہ بکف پشت بسوی تو بہ نشینیم

شیشۂ حیراں از گلاب رشک دارم در بغل
می روم تا شیشی سوے تربت مجنوں کنم

چند نامور شعراء کے ذکر کے بعد صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ فارسی کے ہندو شعراء کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اب تک جتنے تذکرے نظر سے گزرے ان میں تقریباً پانچ سو ہندو شعراء کا تذکرہ ہے۔ حدیقۂ عشرت، سفینۂ خوشگو، ہمیشہ بہار، بہار سخن، محبوب الزمن، گل رعنا (فصل دوم)، سفینۂ ہندی، تذکرۃ الشعرائے ہند (بشاش) نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان، تذکرہ شعرائے اورنگ آباد (محمد سردار علی)،

---

[1] نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان ص ۱۱۹

خوش معرکۂ زیبا، سفینۂ عشرت، نشتر عشق، دکن میں اردو اور چمنستان شعراء وغیرہ میں فارسی کے ہندو شعراء کے حالات وغیرہ درج ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض تذکرے اردو شعراء کے ہیں پھر بھی ان میں بہت سے فارسی گو شعراء کے حالات اس وجہ سے بیان ہوئے ہیں کہ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مشق سخن کرتے تھے۔

○

باب چہارم

شفیق اورنگ آبادی۔ حالاتِ زندگی

فارسی نے غزنوی عہد میں ہندوستان میں قدم رکھا اور عہدِ مغلیہ فارسی کے عروج کا زمانہ رہا۔ اس عہد میں فارسی ادبیات نے ایران سے زیادہ ہندوستان میں سربلندی پائی۔ فارسی اگرچہ ہندوستان کی زبان نہیں تھی پھر بھی اہلِ ہند نے جب اس کی طرف توجہ دی اور اس کو سیکھا تو اہلِ زبان سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ یہ ہندوستانیوں کی صلاحیت تھی کہ انھوں نے مادری زبان کے علاوہ دوسری زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ وہ اہلِ زبان کی صف میں شامل ہوئے۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں نے بھی فارسی زبان و ادب کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ آج بھی بیشتر تاریخی کتب، تذکرے نیز دیگر موضوعات پر فارسی کتابیں اس بات کی شہادت دے رہی ہیں۔ صرف نثری میدان میں ہی نہیں بلکہ شعر و سخن میں بھی اہلِ ہند نے بھرپور حصہ لیا

اور اہلِ زبان کے شانہ بشانہ چلے۔ یہی نہیں بلکہ فارسی کو نیا طرز نیا لب و لہجہ
عطا کیا۔ یہ لب و لہجہ اور یہ اندازِ فکر "سبکِ ہندی" کے نام سے مشہور ہوا۔
سبکِ ہندی نے بیشتر ایرانیوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور ایران میں بھی
مقبولیت حاصل کر لی۔ ہندوستان نے فارسی کے ہزاروں شعراء کو جنم دیا
جن میں مسلمان ہندو سبھی شامل ہیں۔ ہندوستانی فارسی شعراء میں لچھمی نرائن
شفیق کا نام بھی شامل ہے جو نہ صرف ایک شاعر ہیں بلکہ وہ ایک تذکرہ نگار
اور ایک مورخ کی حیثیت سے بھی فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ وہ فارسی نظم و نثر
دونوں پر عبور رکھتے ہیں۔ فارسی شعراء کے تذکرے تاریخی کتابیں اور دیوانِ اشعار
ان کی یادگار ہیں جو ان کے علمی مرتبے کا پتہ دیتے ہیں۔

پیدائش ۲ صفر ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۷۴۵ء کو لالہ منسا رام کے
گھر پیدا ہوئے۔ ان کا نام لچھمی نرائن ماتھر رکھا
گیا۔ ان کا سنہ پیدائش اگرچہ نصیر الدین ہاشمی[1] نے ۱۱۵۷ھ لکھا ہے اور
حاشیہ پر یہ توجیہہ پیش کی ہے کہ:۔

"مولانا عبد الحق صاحب نے چمنستان شعراء کے مقدمہ میں ان کا
سنہ پیدائش ۱۱۵۸ھ لکھا اور چمنستان شعراء ۱۱۷۵ھ کی تصنیف
ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سنہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس سنہ کو
کتابت کی غلطی بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ "مقدمات عبد الحق" میں بھی
یہی سنہ لکھا گیا ہے۔ خود مولانا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ
سال کی عمر میں اس تذکرہ کی ترتیب ہوئی۔ اس لیے صحیح سنہ پیدائش

[1] دکن میں اردو ص ۴۴۲

۱۱۵۷ھ ہے۔"

لیکن ہاشمی صاحب کا یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ تمام تذکرہ نگار
اس بات پر متفق ہیں کہ شفیق کی ولادت ۱۱۵۸ھ میں ہوئی اور خود شفیق نے
گلِ رعنا اور چمنستانِ شعراء میں اپنا سنہ پیدائش ۱۱۵۸ھ ہی لکھا ہے۔
گلِ رعنا میں وہ اپنی پیدائش کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:۔

"مولف[1] در گل زمین اورنگ آباد دوم صفر سنہ ثمان و
خمسین و مائتہ الف (۱۱۵۸ھ) چہرۂ ہستی برافروخت"

اس لیے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے کہ شفیق کا سنہ پیدائش
۱۱۵۸ھ ہی صحیح اور مستند ہے۔

قوم و قومیت شفیق کا تعلق قوم "کھتری کپور" سے ہے اور ان کا
آبائی وطن لاہور ہے لیکن شفیق کی پیدائش اورنگ آباد
میں ہوئی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ان کے دادا بھوانی داس عالمگیری لشکر
کے ساتھ دکن آئے اور اورنگ آباد میں سکونت اختیار کی نیز ملازمت کو ذریعہ
معاش بنایا۔ یوں تو ان کی قوم و قومیت کئی تذکرہ نگاروں نے بیان کی ہے لیکن
یہاں شفیق کے الفاظ میں ان کی قوم و قومیت کا حال سنیئے:۔

"شفیق لچھمی نرائن ماتھر[2] مولف این صحیفہ از قوم کھتری کپور
است جدا و بھوانی داس ہمراہ اردوئے عالمگیری از لاہور وارد دکن
شدہ در اورنگ آباد رنگ توطن ریخت و بہ صیغہ نوکری بسر بردہ ذی

[1] گل رعنا فصل دوم ص ۹۳
[2] " " ص ۹۲

اعتبار بر آمد درین جا صاحب اولاد گردید"۔

شفیق کے مذکورہ بیان کے بعد ان کی قوم و قومیت کے بارے میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ شفیق عرصہ دراز تک اورنگ آباد میں رہے جب سلطنت آصفیہ کا پایۂ تخت اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل ہوا تو وہ بھی حیدرآباد آگئے اور اپنی عمر کے آخری ایام وہیں گزارے۔

خاندان

شفیق کی تعلیم و تربیت کا حال بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کے خاندانی حالات کا بیان کیا جائے۔

بھوانی داس کے منجھلے بیٹے منسارام تھے جب ان کی عمر دس سال کی تھی تو سایۂ پدری سے محروم ہو گئے اور لالہ جسونت رائے نے جو انھیں کے خاندان سے تھے۔ خود شفیق کے بیان کے مطابق "ہم جدی" تھے۔ ان کی پرورش کی۔ آزاد بلگرامی کی سفارش پر نواب صمصام الدولہ بہادر نے ان کو پیشکاری بخشی "الممالک" کا عہدہ عطا کیا اور نواب آصف جاہ نظام الممالک کے عہد میں انھیں شش صوبجات دکن کی پیشکاری پر مامور کیا گیا۔ اس عہدہ کو "صدر الصدور" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے

منسارام جو کمسنی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے تھے مگر لالہ جسونت رائے نے ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ منسارام کو یتیمی کا احساس نہیں ہونے دیا اور ایک باپ کی طرح ان کی پرورش کی اور تعلیم و تربیت کی۔ یہی وجہ ہے منسارام بھی فارسی ادب میں ایک تاریخ داں اور انشا نویس کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

منسارام کو تاریخ و انشا کا ذوق تھا۔ کئی تصانیف ان کی یادگار ہیں "ضوابط آصف جاہ" جس کو قانون دربار آصفی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے یہ سنہ ۱۱۷۵ھ میں

کی تالیف ہے۔ اس میں آصف جاہ کے دربار کے ضوابط کا بیان ہے۔ یہ کتاب شائع بھی ہو چکی ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اس کتاب کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

"قانون[1] نوادر بارگہہ آصف زماں
در پردۂ مجاز حقیقت کند بیاں

بنام ایزد دانا عرشانہ چند ضوابط سرکار نواب مغفرت مآب آصف جاہ طاب ثراہ احقر العباد منسارام پیشکار صدارت صوبجات دکن در شہور سنہ یک ہزار و یک صد و ہفتاد و پنج ہجری می نگارد"۔

اس کے علاوہ ان کی کتاب ماثر[2] نظامی ہے جس میں آصف جاہ اول کے حالات ہیں۔ شروع میں ان کے بزرگوں کے کبھی حالات درج ہیں۔ یہ حالات کچھ تو چشم دید ہیں اور بعض حالات آصف جاہ مرحوم کی زبان سے سنے ہوئے ہیں یہ کتاب سنہ ۱۱۷۲ھ میں مرتب ہوئی۔ ان تصانیف سے منسارام کی قابلیت اور تاریخ نگاری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

شفیق کے دیگر افراد خاندان کے ذیل میں ان کے ایک بھائی روپ نرائن کا حال ملتا ہے۔ یہ شفیق سے عمر میں چھوٹے تھے اور یہ بھی اردو اور فارسی کے شاعر تھے "ذہین" تخلص استعمال کرتے تھے ۲۴ر جمادی الاول سنہ ۱۱۶۲ھ کو پیدا ہوئے "محبوب[3] الزمن" اور "تذکرہ شعرائے[4] اورنگ آباد" (محمد سردار علی) میں ان کی

[1] تذکرۂ مخطوطات جلد چہارم ص ۲۱۳

[2] چمنستان شعراء (مقدمہ عبدالحق) ص ۲

[3] محبوب الزمن ص ۲۴۷

[4] تذکرہ شعرائے اورنگ آباد ص ۱۱

پیدائش ۴ جمادی الاول ۱۱۹۲ھ لکھی جو کسی اعتبار سے صحیح نہیں ہو سکتا کیوں کہ شفیق نے گل رعنا میں ذہین کا سنہ پیدائش ۱۱۶۲ھ لکھا ہے اور گل رعنا ۱۱۸۲ھ کی تالیف ہے یعنی مذکورہ مصنفین کے دیئے ہوئے سنہ پیدائش سے دس سال پہلے گل رعنا لکھی گئی اور اس میں ذہین کا تذکرہ لکھا گیا۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے۔ شفیق ان الفاظ میں روپ نرائن کی پیدائش کا حال بیان کرتے ہیں۔

"ذہینؔ روپ نرائن برادر اعیانی راقم سطور بتاریخ بست وچہارم جمادی الاول سنہ اثنین وستین وماتہ الف (۱۱۶۲ھ) روز دوشنبہ وارد شبستان وجود شد آثار سعادت از ناصیۂ او پیدا است"

ذہین نے میر آزاد بلگرامی اور اولاد محمد خاں ذکا سے اصلاح سخن لی۔ امیر الممالک نواب آصف الدولہ نے منصب اور خطاب "دولی چند" سے سرفراز کیا۔ روپ نرائن کی وفات کے بارے میں محبوب الزمن[۲] اور تذکرہ شعرائے اورنگ آباد[۳] کے مصنفین نے ۱۲۲۳ھ لکھا ہے جو شفیق کا بھی سنہ وفات ہے۔

ذہین کے اشعار کا نمونہ دیا جا رہا ہے جس سے ان کی ذہانت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

چوں دستش را کند رنگیں حنا آہستہ آہستہ
کند پرواز رنگ از روئے ما آہستہ آہستہ

---

[۱] گل رعنا۔ فصل دوم ص۵۰
[۲] محبوب الزمن ص۴۴۲
[۳] تذکرہ شعرائے اورنگ آباد ص۱۱

خداوندا اگر بیمار شد از دوری ایں رہ
کہ از کوئیش رسد باد صبا آہستہ آہستہ

ہمچو قمری در جہاں شادیم ما
باوجود طوق آزادیم ما
یاد ما تصویر جاناں می کشد
عشق می داند کہ بہزادیم ما

افسوس کہ از دولت دیدار تو دورم
تقدیر چنیں بود قضا را چہ کند کس

شفیق کے خاندان کے تعارف کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا گھرانہ تہذیب وتمدن سے مزین تھا۔ علم کی شمعیں روشن تھیں۔ تاریخ نویسی اور شعر وشاعری کا دور دورہ تھا۔ منسا رام کے مربی لالہ جسونت رائے کے پوتے منشی لچھمی نرائن ولد منی رام تھے جو ایک بلند پایہ انشا پرداز تھے۔ ان کی ایک کتاب "انشائے لچھمی نرائن" ان کی یادگار ہے۔ یہ کتاب "رقعات لچھمی نرائن" کے نام سے شائع بھی ہو چکی ہے اور اس کا ایک مخطوطہ سلطانیہ لائبریری میں موجود ہے۔

تعلیم وتربیت

قدیم دور میں اسکول وکالج کی تعلیم کا رواج بہت کم تھا اور گھریلو تعلیم وتربیت کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ تقریباً ہر ذی حیثیت اپنے بچوں کے لیے معلم ومربی کا انتظام کرتا تھا جس سے آداب زندگی، تہذیب واخلاق سے واقفیت کے ساتھ ساتھ بچے

پیدائش ۴ رجمادی الاول ۱۱۹۲ھ لکھی جو کسی اعتبار سے صحیح نہیں ہو سکتا کیوں کہ شفیق نے گلِ رعنا میں ذہین کا سنہ پیدائش ۱۱۶۲ھ لکھا ہے اور گلِ رعنا ۱۱۸۲ھ کی تالیف ہے یعنی مذکورہ مصنفین کے دیئے ہوئے سنہ پیدائش سے دس سال پہلے گلِ رعنا لکھی گئی اور اس میں ذہین کا تذکرہ لکھا گیا۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے۔ شفیق ان الفاظ میں روپ نرائن کی پیدائش کا حال بیان کرتے ہیں۔

"ذہین[۱] روپ نرائن برادر اعیانی راقم سطور بتاریخ بست وچہارم
جمادی الاول سنہ اثنین وستین و مائۃ الف (۱۱۶۲ھ) روز دوشنبہ
وارد شبستان وجود شد آثار سعادت از ناصیہ او پیدا است"

ذہین نے میر آزاد بلگرامی اور اولاد محمد خاں ذکا سے اصلاح سخن لی۔ امیر الممالک نواب آصف الدولہ نے منصب اور خطاب "دولی چند" سے سرفراز کیا۔ روپ نرائن کی وفات کے بارے میں محبوب الزمن[۲] اور تذکرہ شعرائے اورنگ آباد[۳] کے مصنفین نے ۱۲۲۳ھ لکھا ہے جو شفیق کا بھی سنہ وفات ہے۔

ذہین کے اشعار کا نمونہ دیا جا رہا ہے جس سے ان کی ذہانت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

چوں دستش را کند رنگیں حنا آہستہ آہستہ
کند پرواز رنگ از روی ما آہستہ آہستہ

---

۱ گلِ رعنا۔ فصل دوم ص۵۰
۲ محبوب الزمن ص۴۴۷
۳ تذکرہ شعرائے اورنگ آباد ص۱۱

خداوندا اگر بیمار شد از دوری ایں رہ
کہ از کویش رسد باد صبا آہستہ آہستہ

ہمچو قمری در جہاں شادیم ما
باوجود طوقِ آزادیم ما
یاد ما تصویر جاناں می کشد
عشق می داند کہ بہزادیم ما

افسوس کہ از دولتِ دیدار تو دورم
تقدیر چنیں بود قضا را چہ کند کس

شفیق کے خاندان کے تعارف کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا گھرانہ تہذیب و تمدن سے مزین تھا۔ علم کی شمعیں روشن تھیں۔ تاریخ نویسی اور شعر و شاعری کا دور دورہ تھا۔ منسا رام کے مربی لالہ جسونت رائے کے پوتے منشی لچھمی نرائن ولد منی رام تھے جو ایک بلند پایہ انشا پرداز تھے۔ ان کی ایک کتاب "انشاء لچھمی نرائن" ان کی یادگار ہے۔ یہ کتاب "رقعات لچھمی نرائن" کے نام سے شائع بھی ہو چکی ہے اور اس کا ایک مخطوطہ سلطانیہ لائبریری میں موجود ہے۔

تعلیم و تربیت

قدیم دور میں اسکول و کالج کی تعلیم کا رواج بہت کم تھا اور گھریلو تعلیم و تربیت کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ تقریباً ہر ذی حیثیت اپنے بچوں کے لیے معلم و مربی کا انتظام کرتا تھا جس سے آدابِ زندگی، تہذیب و اخلاق سے واقفیت کے ساتھ ساتھ بچے

علم وادب سے بھی بہرہ مند ہو جاتے تھے۔ ہر زمانے اور ہر دور میں کچھ نہ کچھ عوامی
رسم ورواج بھی ہوتے ہیں۔ آج کل ابتدائی تعلیم انگریزی اور کسی صوبائی زبان
(دکن میں تلگو اور اترپردیش میں ہندی وغیرہ) سے شروع کی جاتی ہے لیکن
پہلے عربی وفارسی کی تعلیم کا رواج بہت تھا۔ مغل دور میں تو فارسی ہندوستان کی
سرکاری زبان بن چکی تھی جس کی وجہ سے لوگوں میں فارسی تعلیم و تعلم کا شوق
رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لالہ منسارام نے اپنے بیٹے لچھمی نرائن کو شاہ عبد القادر
صاحب کے پاس عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم کے لیے بھیجا جس کا بیان لچھمی نرائن
نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"در عمر[1] پانزدہ سالگی بخدمت قبلہ برحق شیخ عبد القادر صاحب
سلمہ اللہ تعالیٰ کتب متعارفہ سند کردہ واز سوادہ بیاض واقف گردید"

ابتدائی تعلیم کے بعد شعر و شاعری سے دلچسپی کی وجہ سے میر غلام علی آزاد
بلگرامی کی شاگردی اختیار کی۔ میر صاحب اگرچہ بلگرام کے رہنے والے تھے لیکن
اس وقت اورنگ آباد میں قیام پذیر تھے۔ لچھمی نرائن شفیق ان الفاظ میں
رقمطراز ہیں کہ۔

"از آں[2] جا کہ شعر را دوست می داشت کہ بسلک تلامذہ قبلہ
دین و دنیا حضرت میر غلام علی آزاد مدظلہ العالی در آمد"

شفیق میر آزاد کی شاگردی میں آنے کے بعد میر عبد القادر مہربان
اورنگ آبادی کے مقابلے میں مخفی طور پر صاحب تخلص کے ساتھ شاعری

۱؎ چمنستان شعراء ص ۴۹۴
۲؎ " ص ۴۹۴

کرنے لگے۔ صاحب تخلص بھی میر آزاد مرحوم نے ان کو عنایت کیا تھا۔ شفیق نے
ایک دیوان مرتب کیا جب وہ سن شعور کو پہونچے تو وہ دیوان انھوں نے خود
ضائع کر دیا۔ دیوان ضائع کرنے کا سبب اشعار کی ناموزونیت اور بچکانہ طرز
فکر تھا جیسا کہ وہ خود اپنے حالات کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

"بسلک[1] تلامذہ قبلہ دین و دنیا حضرت میر غلام علی آزاد مدظلہ العالی
در آمدہ و بتقابل میر عبد القادر مہربان کہ یکی از مہرۂ تابان آنجناب
است پوشیدہ صاحب تخلص قرار دادہ دیوان غزلیات مرتب قریب
دو ہزار بیت مرتب ساخت چوں مرتبہ والا قدر کی حیثیت پیدا کردہ
باصطلاح شعراء و قواعد ماہر گردید سابق را محض تقویم پارینہ دیدہ
یک قلم بر سہمہ ہا خط کشید"

مذکورہ دو ہزار اشعار کے دیوان کو کالعدم قرار دینے کے بعد شعر و سخن سے دلچسپی
میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ مسلسل شاعری کرتے رہے۔ ان کی شہرت و مقبولیت روز
بروز بڑھتی رہی اٹھارہ سال کی عمر میں تصنیف و تالیف میں بھی مشغول ہوئے
اور اردو شعراء کا تذکرہ "چمنستان شعرا" کے نام سے مرتب کیا جس کے دیباچے میں
وہ اس طرح رقمطراز ہیں کہ۔

"ریزہ[2] چینیں مائدہ خوان فصاحت یعنی بندۂ لچھمی نرائن المتخلص
بہ صاحب در ریختہ و شفیق در فارسی قبل ازیں از سن دوازدہ سالگی
مشق سخن فارسی می نمود۔"

۱؎ چمنستان شعرار ص ۴۹۲
۲؎ " ص ۱

کم سنی سے شعر گوئی کا شوق تھا اور صاحب تخلص استعمال کیا لیکن اٹھارہ سال کی عمر میں ان کو جب یہ معلوم ہوا کہ فارسی شعرا میں میر محمد مسیح صاحب تخلص استعمال کرتے تھے تو انھوں نے اپنے شفیق استاد میر غلام علی آزاد سے نئے تخلص کی التجا کی اور انھوں نے ازراہ شفقت شفیق تخلص عنایت فرمایا۔ اردو شاعری میں ان کی شہرت اس وقت کافی ہو چکی تھی اس لیے انھوں نے اردو شاعری میں تخلص تبدیل نہیں کیا اور صاحب ہی رہنے دیا۔ اس کے علاوہ فارسی شاعری میں جہاں شفیق موزوں نہیں ہو سکتا تھا وہاں صاحب ہی استعمال کیا۔ مذکورہ بیان سے یہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ لچھمی نرائن نے فارسی شاعری میں شفیق اور صاحب دونوں تخلص استعمال کئے ہیں اور اردو میں صرف صاحب تخلص استعمال کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ "چمنستان شعراء" کے ص ۹۴[۱] پر اس طرح رقمطراز ہیں کہ:۔

"الحال[۱] کہ سال ہژدہ از عمر گزشتہ باشد چوں مطلع شد کہ میر محمد مسیح صاحب تخلص در فارسی گزشتہ است بجناب فیض مآب حضرت میر صاحب و قبلہ التماس تخلص نمود آنجناب ازراہ شفقت تخلص شفیق عنایت فرمودند لیکن از آنجا کہ ریختہ جات فقیر درین جا بہ عوام و خواص اشتہار یافتہ صاحب تخلص در ریختہ برقرار داشتہ شدہ در بعضی بحور کہ شفیق نمی گنجد ناچار تخلص صاحب آوردہ می شود"۔

انھوں نے اپنے نئے تخلص کی بھی تاریخ کہی۔ نئے تخلص کی تاریخ "تخلص نو"

---

[۱] چمنستان شعراء ص ۹۴

سے نکالی اور ایک قطعۂ تاریخ بھی نظم کیا جس کا آخری مصرعہ مادۂ تاریخ ہے ملاحظہ ہو:۔

از حضرت فیض بخش آزاد گردید مرا تخلص انعام
گفتم تاریخ ایں عنایت امداد شفیق شد مرا نام

۱۱۷۶ھ

اساتذہ

شاہ سید عبد القادر سامی اورنگ آبادی شفیق کے پہلے استاد ہیں۔ ان کا اصلی نام شاہ غلام قادر ہے۔ ان کے احوال کے ذیل میں شفیق اس طرح لکھتے ہیں کہ:۔

"فقیر[۱] مودت نامہ بہ تحریر آورد راقم السطور از ملاقات مستوفی فیضی سرمایہ سرور اندوخت و آں خلق مجسم ہم بکرات و مرات رونق افزائے کلبۂ خاکسار شد"

"آپ[۲] کے جد بزرگوار فیض اللہ شاہ جہاں کے عہد میں جلیل القدر خدمات پر مامور تھے اور عالمگیر کے عہد میں شاہی لشکر کے ہمرکاب اورنگ آباد آئے محمد اعظم شاہ کی سرکار میں کتب خانہ کے داروغہ مقرر ہوئے۔ آپ کے والد ماجد نے نوکری چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی تھی۔

آپ کی ولادت اورنگ آباد میں ہوئی تھی۔ تعلیم و تربیت کے بعد شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ[۳] اپنے والد ماجد کے مرید و خلیفہ تھے اور قادریہ سلسلہ

---

[۱] چمنستان شعراء ص ۱۱۱
[۲] محبوب الزمن ص ۵۰۵
[۳] گلزار آصفیہ ص ۳۵۷

بیعت میں تھے۔

آپ نے کئی ہزار اشعار کی مثنوی[۲] "سرو شمشاد" لکھی تھی جواب نایاب ہو چکی ہے۔ ۲۹ر صفر ۱۱۹۰ھ کو آپ کی وفات ہوئی اور شہر حیدر آباد کے باہر دبیر پورہ سے متصل اپنے پدر بزرگوار کے پائینتی دفن ہیں۔

تصویر جاناں[۲] کے مقدمہ میں حمید الدین شاہد نے شفیق کا پہلا استاد میر عبدالقادر مہربان کو بتایا ہے اور تریندر بہادر سریواستو نے بھی میر مہربان ہی کو ان کا پہلا استاد بتایا ہے۔ یہ صرف غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ شفیق نے چمنستان شعراء میں "شیخ عبدالقادر" لکھا ہے۔ لفظ شیخ بزرگوں کے لیے بھی استعمال ہوتا رہا ہے اس لیے شفیق کے پہلے استاد سید عبدالقادر سامی ہی تھے عبدالقادر مہربان بھی سید تھے اور عمر کے اعتبار سے وہ شفیق سے صرف آٹھ سال بڑے تھے اس لیے کسی اعتبار سے ان کو شیخ نہیں لکھا جا سکتا

شفیق کے شعر و سخن کے استاد میر غلام علی آزاد بلگرامی تھے۔ شفیق کو ان سے حد درجہ عقیدت تھی اور ان کی مدح میں اشعار بھی کہے۔ یہاں میر آزاد کے حالات زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

میر آزاد نہ صرف شاعر تھے بلکہ ایک جید عالم تھے۔ صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے۔ آپ کی ولادت محلہ میدان[۳] پورہ موضع بلگرام میں ۲۵ر صفر ۱۱۱۶ھ میں ہوئی۔ آپ کا سلسلۂ نسب عیسیٰ موتم الاشبال ابن زید شہید ابن

۱؎ تذکرہ شعرائے اورنگ آباد ص ۱۴۲

۲؎ تصویر جاناں (مقدمہ از شاہد) ص ۷

۳؎ خزانہ عامرہ ص ۱۲۳

امام زین العابدینؑ پر منتہی ہوتا ہے جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں۔

"گرچہ[۱] باشد موتم الاشبال عیسیٰ جد من

عیسیٰ جاں بخش شیرانم بامداد نفس

آپ کی تعلیم[۲] آپ کے مطابق پانچ اساتذہ سے ہوئی۔ ۱۔ میر طفیل محمدؒ سے علوم درسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۲۔ میر عبدالجلیلؒ سے فنون ادب اور حدیث و سیرت کی تعلیم حاصل کی۔ ۳۔ علامہ میر عبدالجلیل کے فرزند سید میر محمد صاحب سے عروض و قوافی کی تعلیم حاصل کی۔ ۴۔ مولانا شیخ محمد حیات سے مدینۂ منورہ میں صحیح بخاری کی تعلیم حاصل کی اور مولانا سے صحاح ستہ کا اجازہ حاصل کیا۔ ۵۔ مولانا شیخ عبدالوہاب طنطاوی سے مکہ معظمہ میں فوائد علم حدیث کی تحصیل کرنے کے بعد سید لطف اللہ بلگرامی طاب ثراہ کی بیعت میں داخل ہوئے ۱۱۵۲ھ میں اورنگ آباد میں آکر قیام کیا۔

آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ آصف جاہ ثانی، نواب ناصر جنگ شہید، غلام علی ارشد، افضل بیگ قاقشال، میر عبدالقادر مہربان، عبدالوہاب افتخار، لچھمی نرائن شفیق اور ان کے علاوہ نہ جانے کتنے شعراء آپ کے شاگردوں میں شامل تھے۔

آپ نہ صرف فارسی کے شاعر تھے بلکہ عربی اور اردو میں بھی مشق سخن

۱؎ خزانہ عامرہ ص ۱۲۳

۲؎ " " ص ۱۲۴-۱۲۳

۳؎ شام غریباں ص ۲۹۱

۴؎ موتم الاشبال: شیر کے بچے کو یتیم کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ اکثر شکاری جو شیر کا شکار کرتے ہیں ان کو اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بیعت میں تھے۔

آپ نے کئی ہزار اشعار کی مثنوی[۱] "سرو شمشاد" لکھی تھی جواب نایاب ہوچکی ہے۔ ۲۹ صفر سنہ ۱۱۹۰ھ کو آپ کی وفات ہوئی اور شہر حیدرآباد کے باہر دبیر پورہ سے متصل اپنے پدر بزرگوار کے پائینتی دفن ہیں۔

تصویر جاناں[۲] کے مقدمہ میں حمید الدین شاہد نے شفیق کا پہلا استاد میر عبدالقادر مہربان کو بتایا ہے اور ترنیدر بہادر سریواستو نے بھی میر مہربان ہی کو ان کا پہلا استاد بتایا ہے۔ یہ صرف غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ شفیق نے چمنستان شعراء میں "شیخ عبدالقادر" لکھا ہے۔ لفظ شیخ بزرگوں کے لیے بھی استعمال ہوتا رہا ہے اس لیے شفیق کے پہلے استاد سید عبدالقادر سامی ہی ہیں عبدالقادر مہربان بھی سید تھے اور عمر کے اعتبار سے وہ شفیق سے صرف آٹھ سال بڑے تھے اس لیے کسی اعتبار سے ان کو شیخ نہیں لکھا جا سکتا

شفیق کے شعر و سخن کے استاد میر غلام علی آزاد بلگرامی تھے۔ شفیق کو ان سے حد درجہ عقیدت تھی اور ان کی مدح میں اشعار بھی کہے۔ یہاں میر آزاد کے حالات زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

میر آزاد نہ صرف شاعر تھے بلکہ ایک جید عالم تھے۔ صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے۔ آپ کی ولادت محلہ میدان[۳] پورہ موضع بلگرام میں ۲۵ صفر سنہ ۱۱۱۶ھ میں ہوئی۔ آپ کا سلسلۂ نسب عیسیٰ موتم الاشبال ابن زید شہید ابن

۱؎ تذکرہ شعرائے اورنگ آباد ص ۱۴

۲؎ تصویر جاناں (مقدمہ از شاہد) ص ۲

۳؎ خزانہ عامرہ ص ۱۲۳

امام زین العابدینؑ پر منتہی ہوتا ہے جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں۔

"گرچہ[۱] باشد موتم الاشبال[۴] عیسیٰ جد من
عیسیٰ جاں بخش شیرانم بامداد نفس

آپ کی تعلیم[۲] آپ کے مطابق پانچ اساتذہ سے ہوئی۔ ۱۔ میر طفیل محمدؒ سے علوم درسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۲۔ میر عبدالجلیلؒ سے فنون ادب اور حدیث و سیرت کی تعلیم حاصل کی۔ ۳۔ علامہ میر عبدالجلیل کے فرزند سید میر محمد صاحب سے عروض و قوافی کی تعلیم حاصل کی۔ ۴۔ مولانا شیخ محمد حیات سے مدینۂ منورہ میں صحیح بخاری کی تعلیم حاصل کی اور مولانا سے صحاح ستہ کا اجازہ حاصل کیا۔ ۵۔ مولانا شیخ عبدالوہاب طنطاوی سے مکہ معظمہ میں فوائد علم حدیث کی تحصیل کرنے کے بعد سید لطف اللہ بلگرامی طاب ثراہ کی بیعت میں داخل ہوئے ۱۱۵۲ھ[۳] میں اورنگ آباد میں آکر قیام کیا۔

آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ آصف جاہ ثانی، نواب ناصر جنگ شہید، غلام علی ارشد، افضل بیگ قاقشال، میر عبدالقادر مہربان، عبدالوہاب افتخار، لچھمی نرائن شفیق اور ان کے علاوہ نہ جانے کتنے شعراء آپ کے شاگردوں میں شامل تھے۔

آپ نہ صرف فارسی کے شاعر تھے بلکہ عربی اور اردو میں بھی مشق سخن

۱؎ خزانہ عامرہ ص ۱۲۳

۲؎ " " ص ۱۲۳-۱۲۴

۳؎ شام غریباں ص ۲۹۱

۴؎ موتم الاشبال، شیر کے بچے کو یتیم کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ اکثر شکاری جو شیر کا شکار کرتے ہیں ان کو اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

رکھتے تھے۔ عربی میں آپ کا دیوان "سبعہ سیارہ" کے نام سے ہے۔ آپ کی تصانیف میں سرو آزاد، ید بیضا اور خزانہ عامرہ، غزالان ہند، شمامۃ الهند فی ذکر الهند، سبحۃ المرجان اور شرح بخاری تا کتاب زکوٰۃ شامل ہیں۔ جن میں بعض کتابیں عربی میں ہیں۔ آپ کی شرافت نفس علم و فضل اور بردباری کے سلسلے میں کئی واقعات ملتے ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک واقعہ نقل کر رہے ہیں جس سے ان کی کریم النفسی اور شریف الطبعی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

"ایک دفعہ[1] آپ کی ایک قیمتی شال چوری ہو گئی چند روز بعد اس کو ایک آدمی بیچنے کے لیے بازار میں لایا۔ آپ کے کسی دوست نے شال پہچان لی اور فروخت کنندہ کو میر آزاد کی خدمت میں پیش کیا اور کہا کہ اس کو گرفتار کرانا چاہیئے اور پوچھنا چاہیئے کہ یہ شال کہاں سے لایا۔ آپ نے دوست سے کہا کہ یہ معاملہ حاکم وقت کے پاس جائے گا اور میں مدعی ہوں گا۔ میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ بھرے دربار میں بازاری آدمی کے مقابلے میں آؤں"۔

آپ کو فارسی تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا۔ لاتعداد تاریخیں کہی ہیں۔ اور فارسی[2] دیوان تقریباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر چند اشعار درج کئے جا رہے ہیں۔

روزی[3] کہ باز بینم آں یار مہرباں را
بر پای او بعالم چشم گہر فشاں را

سلہ تجرب الزمن صـ ۲۶۹

سلہ " "

سلہ شام غریباں صـ ۲۹

چندیں دریں گلستاں ریزیم رنگ عشرت
گر باد واگذارد بر شاخ آشیاں را

شادم ز قامت خم پیرانہ سر کہ دایم
بوسم زمین خدمت آں یار نوجواں را

یک لحظہ چشم خود را ز آئینہ بر نہ داری
تا چند رنجہ سازی بیمار ناتواں را

می خرامد یار بد خو الغیاث　　　　می رسد شیرانہ آہو الغیاث

چہ گوتہ مرغ چمن شد نہ باغباں گستاخ
کہ می کند شرو شوری بہ بوستاں گستاخ

بجا است بلبل شوریدہ را قفس کردن
ہمیشہ بال فشاند بہ گلستاں گستاخ

شراب خوردہ کجا می رود خدا حافظ
کشادہ بند قبا می رود خدا حافظ

ہزار حیف کہ پروانہ قدر خود نہ شناخت
بہ پیش شمع چرا می رود خدا حافظ

لچھمی نرائن شفیق آپ سے حد درجہ عقیدت رکھتے تھے اور انھوں نے آپ کی شان میں ہزاروں اشعار کہے ہیں۔ شام غریباں میں میر صاحب کے حالات کے ذیل میں شفیق کا بیان ہے کہ میں نے پانچ ہزار اشعار کی

مستقل کتاب "جواہر زواہر" کے نام سے آپ کی مدح میں مرتب کی ہے یہاں پر میر آزاد صاحب کی شان میں صرف ایک غزل پیش کی جا رہی ہے جس سے شفیق کی اپنے استاد سے عقیدت و انسیت کا پتہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔[1]

لامکاں است مقام آزاد
فوق عرش است خرام آزاد

سجہ گرداں زکواکب ہر شب
فلکِ پیر بنامِ آزاد

خرمنِ ہستی اعدا سوزد
برق رخشاں حسامِ آزاد

در گلستانِ جہاں ہر گل و خار
مورد رحمت عامِ آزاد

چہ ادا ساقیٔ کوثر باشد[2]
آبِ خضر است بہ جامِ آزاد

گل شود گوش ہمہ تن بہ چمن
گر برد باد پیامِ آزاد

پیش آئینہ ضمیراں طوطی
می کند وصف کلامِ آزاد

اے خداوندِ جہاں با دمدام
ساغرِ عیش بہ کامِ آزاد

[1] گل رعنا (فصل دوم) ص۹۵-۹۴

صاحبِ ہر دو جہاں است شفیق
ہر کہ گردید غلام آزاد

تلامذہ

مختلف تذکروں کا مطالعہ کیا لیکن شفیق کے شاگردوں کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے کتنے شاگرد تھے۔ حمید الدین شاہد نے "تصویر جاناں" میں بطور مقدمہ جو عبارت لکھی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ غلام مصطفیٰ سخن اورنگ آبادی شفیق کے شاگردوں میں شامل تھے۔ انھوں نے شفیق کی تاریخ وفات بھی کہی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

استادِ من شفیق افسوس
از سپنجی سرائے فانی رفت

اس قطعۂ تاریخ میں چار شعر ہیں۔ آخری شعر کا مصرعہ ثانی مادۂ تاریخ ہے۔ قطعہ تاریخ "وفات" عنوان کے تحت درج کیا جائے گا۔ غلام مصطفیٰ سخن کے حالات تذکرہ شعرائے اورنگ آباد" (محمد سردار علی) اور محبوب الزمن میں شامل نہیں ہیں۔ معلوم نہیں وہ کس طرح گمنامی کا شکار ہوئے۔ سخن کے مکمل حالات تو نہیں مل سکے جو مختصر حالات ہمیں ملے ہیں وہ درج کئے جا رہے ہیں۔

"میر غلام مصطفیٰ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے ۱۱۸۷ھ میں پیدا ہوئے ان کی وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہ ہو سکی البتہ ۱۲۳۹ھ تک ان کے زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ اورنگ آباد سے حیدر آباد منتقل ہونے کے[1]

[1] دکن میں اردو ص۵۳۷

بعد سلطنتِ آصفیہ کے شاہزادوں اور مدار المہاموں کا تقرب حاصل ہوا قصائد
و غزلیں یادگار چھوڑی ہیں۔ دیوان ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں
ہو سکا۔ دیوان[1] کا مخطوطہ سنٹرل لائبریری حیدر آباد (کتب خانہ آصفیہ)
میں موجود ہے۔ دیوان کے آخر میں کچھ قطعات تاریخ بھی درج ہیں جس میں
شفیق کی وفات پر کہا گیا قطعہ تاریخ وفات بھی شامل ہے۔

سخن اردو فارسی دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے "دکن میں اردو"
میں ان کا تذکرہ اس بات کا ثبوت ہے اور اس کے علاوہ فارسی میں شفیق
کی وفات پر قطعہ تاریخ ان کی فارسی شعر گوئی کو ثابت کر رہا ہے اگرچہ
ان کے اردو فارسی کلام کا انتخاب ابھی تک نہیں مل سکا ہے جس کے ذریعہ
ان کے کلام پر تبصرہ کیا جا سکے یا ان کا شاعرانہ مرتبہ متعین کیا جا سکے۔ پھر
بھی ان کا قطعہ تاریخ دیکھنے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ فارسی شاعری
میں عبارت صاف اور سلیس استعمال کرتے ہیں اور طرز بیان نہایت خوبصورت
اور دلکش ہوتا ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ ان کا کلام علاوہ قطعہ تاریخ کے اور کچھ
دستیاب نہ ہو سکا اور قطعہ تاریخ بھی زبانِ شفیق ہی کی رحلت پر کہا گیا
ہے جس کو "وفات" کے ذیل میں دیا جائے گا۔

معاصرین

کوئی بھی ادیب ہو یا شاعر اس کی شخصیت کو پہچاننے کے
لیے "معاصرین" کی معرفت ضروری ہے۔ بغیر معاصرین
کی شناسائی کے اس کے مرتبہ اور مقام کا تعین نہیں ہو سکتا۔" موازنہ نگاری
کا دار و مدار بھی اسی امر پر ہے کہ کسی کے مرتبہ کو بتانے کے لیے اس کے کسی

۱؎ تصویر جاناں (مقدمہ شاہد)

معاصر سے موازنہ کیا جاتا ہے جس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ کس میں کیا
خوبی ہے اور کس میں کیا خامی۔ اگر معاصرین کی تعداد کم ہو تو بہت آسانی سے مرتبہ
کا تعین کیا جا سکتا ہے جیسے مرثیہ نگاری میں انیس و دبیر لیکن جہاں معاصر
فن کاروں کی کثرت ہو وہاں اس امر میں کافی دشواری پیدا ہو سکتی ہے۔

شفیق نے ایسے دور میں آنکھ کھولی جب ہر طرف شعر و شاعری کا دور
دورہ تھا۔ جگہ جگہ علم و ادب کے چراغ روشن تھے ہندوستان کا منارہ ادب
جگمگا رہا تھا۔ شمالی ہند میں میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا اور خواجہ میر درد
استاد فن سمجھے جاتے تھے۔ دکن میں شفیق اور ایمان اپنا رنگ جمائے تھے جیسا کہ سید
اشفاق حسین نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے کہ:۔

"شمالی ہند میں جس وقت میر، سودا و درد شعر و شاعری کے
استاد مانے جاتے تھے اورنگ آباد میں شفیق اور حیدر آباد میں ایمان
اپنی شاعری کا رنگ جمائے ہوئے تھے"[1]

شفیق کا تعلق دکن سے تھا اور اس وقت دکن میں سلطنت آصفیہ
کا قیام ہو چکا تھا۔ سلطنت آصفیہ کا پہلا دور سنہ ۱۱۵۰ھ تا سنہ ۱۲۰۰ھ کے دوران
"مرقع سخن" کے مطابق پچاس سے زائد شعراء کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ سلطنت
آصفیہ کے دور اول کے ذیل میں صاحب "مرقع سخن" یوں رقمطراز ہیں کہ:۔

"اس[2] دور کے پچاس سے زائد شاعروں کا پتہ چلتا ہے کہ
جن میں اکثر اورنگ آبادی ہیں لیکن بعد میں جب سنہ ۱۱۸۲ھ حیدر آباد

۱؎ مرقع سخن (مرتبہ زور) ص ۶۰

۲؎ مرقع سخن ص ۱۵-۱۶

سلطنت آصفیہ کا دار الحکومت قرار پایا تو علمی چہل پہل اور شعر و سخن کی سرگرمیاں بھی یہیں منتقل ہوگئیں اور اس دور کے متعدد شعرا اساتذہ فن سمجھے جاتے تھے۔ یہاں اس دور کے صرف چار شاعر سراج، درگاہ، شیدا اور تجلی کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کئے جارہے ہیں۔ ان کے معاصرین میں محمد ماہ محرم (متوفی ۱۱۶۶) مرزا داؤد (۱۱۶۸) نورالدین علی خاں رنگین (۱۱۷۰) بخشی میر عاشق علی خاں ایما (۱۱۷۲) مرتضی مہدی (۱۱۷۴) کنھیا مل مہا سنگھ حقیر (۱۱۷۷) مہر علی مہر (۱۱۷۷) مرزا مغل کمتر (۱۱۸۳) مرزا عطا ضیا (۱۱۸۳) شاہ فضل اللہ فضلی (۱۱۸۴) منور الدولہ یاور (۱۱۸۵) خواجہ ابوالبرکات خاں عشرت (۱۱۸۷) معتبر خاں عمر (۱۱۸۷) میر حفیظ اللہ واحد (۱۱۸۸) میر فخرالدین فخر (۱۱۹۰) میر عبدالحیٔ خاں صمصام الملک صارم (۱۱۹۲) شیخ احمد مضطر (۱۱۹۴) مرزا جمال اللہ عشق (۱۱۹۵) لال چند رنگین (۱۱۹۵) سرو بجی رائے لالہ (۱۲۰۰) الفت خاں مبتلا (۱۲۰۰) مرزا محمدی بیگ مرزا (۱۲۰۱) شیخ ظہورالدین نادر (۱۲۰۱) موہن لال مہتاب (۱۲۰۲) کے علاوہ لچھمی نرائن شفیق شاہ عنایت اللہ فتوت، اسد علی خاں تمنا، لالہ جے کشن بیجان اور محمد بیگ رضا وغیرہ کے کلام کے نمونے مختلف تاریخوں اور تذکروں مثلاً گلزار آصفیہ، چمنستان شعرا، محبوب الزمن، دکن میں اردو تذکرہ شعرائے اورنگ آباد اور مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں"۔

مذکورہ اقتباس کے بعد اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ اس وقت کتنے

شعرا موجود تھے۔ ظاہر ہے کہ تمام شعراء کے ذکر کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے اس لیے شفیق کے صرف ان معاصرین کا مختصراً تذکرہ کیا جارہا ہے جن سے شفیق کے تعلقات اور دوستانہ روابط تھے۔

۱۔ انصاف ہمدانی

نقد علی خاں ایجاد کے فرزند تھے اور علی نقی خاں نام تھا۔ حیدرآباد دکن میں[1] ۱۱۷۳ھ میں پیدا ہوئے۔ "صاحب اقبال مبارک قدم سنتا" سے تاریخ پیدائش برآمد ہوتی ہے۔ فنون ادب اور علوم حکمت میں مہارت رکھتے تھے۔ عالم شباب میں شعر گوئی کا شوق ہوا۔ ابتدا میں اپنے والد ماجد سے اصلاح لیتے تھے بہت جلد زمرۂ شعراء میں مشہور ہو گئے بقول شفیقی گیلانی "شاگرد رفتہ رفتہ باستادی رسید" اردو و فارسی دونوں میں ذوق سخن تھا۔ لچھمی نرائن لکھتے ہیں کہ میں[2] ۱۱۸۰ھ میں حیدرآباد وارد ہوا۔ انصاف سے چند روز خوب ملاقات رہی۔ اکثر اوقات مشاعرہ کا ہوا۔ انصاف ۱۱۸۲ھ میں اورنگ آباد میں رونق افروز ہوئے فقیر سے ملاقات ہوئی۔ چند روز مقیم رہے۔ خوب لطف رہا۔ آپ کے کلام کا نمونہ ذیل میں دیا جارہا ہے ؎

دست قاتل بہ ہم روز جزا داماں را
من نہ آنم کہ فراموش کنم احساں را

نشوم دشمن ہجراں اگرم قتل کند
بسکہ بے وصل بتاں دوست ندارم جاں را

---

[1] محبوب الزمن ص ۲۰۲

[2] بحوالہ محبوب الزمن ص ۲۰۳

روئے او دیدم نمودم محو داغ خویش را
صبح روشن شد زدم دامن چراغ خویش را

اوج نمک حراماں ہرگز نمی توان دید
خورشید چشم پوشید وقت ظہور مہتاب

۲۔ احسان

نواب سہام جنگ کے فرزند ارجمند میر عباس علی خاں احسان کی حیدرآباد میں ولادت ہوئی۔ کمسنی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ ان کا کلام سلیس و بامحاورہ ہوتا تھا۔ ہجو گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ لچھمی نرائن شفیق[1] نے اعظم الامرا کے نسبت کچھ نامناسب اشعار کہے تھے جس پر انھوں نے شفیق کی ہجو میں ان کے اشعار کی رد لکھی تھی اور اعظم الامرا کی سرکار سے جاگیر و انعام حاصل کیا تھا۔ ان کا فارسی نمونۂ کلام نہیں مل سکا۔

۳۔ میر محمد میر اورنگ آبادی

میر محمد میر اورنگ آبادی شفیق کے دوستوں میں تھے اور میر تخلص استعمال کرتے تھے۔ شفیق کے یہ کہنے پر کہ میر تقی میر ہندوستان میں موجود ہیں اشتراک تخلص مناسب نہیں ہے اس لیے اپنا تخلص بدل کر "بندہ" رکھا۔ ان کے اردو شاعر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ فارسی شعر گوئی کے متعلق پتہ نہیں چلتا کہ کہتے تھے یا نہیں اس لیے ان کے حالات اور نمونۂ کلام نہیں دے جا رہے ہیں۔

۱۔ محبوب الزمن ص ۲۳۸

۴۔ پناہ اورنگ آبادی

محمد پناہ نام تھا۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر گوئی کا شوق تھا[1]۔ شفیق سے دوستانہ روابط تھے۔ خوش سلیقہ اور وضع قطع کے پابند تھے۔ اشعار سلیس اور صاف ہوتے تھے۔ تقریباً ۱۲۰۰ھ میں انتقال ہوا۔ ان کا فارسی نمونۂ کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

۵۔ دولت آسیری

میر دولت علی نام اور مظفر علی[2] شاہ خطاب ہے۔ بسلسلۂ روزگار اورنگ آباد تشریف لائے۔ شفیق سے بے حد دوستانہ روابط تھے۔ ریختہ میں اکثر شفیق کا اتباع کیا ہے۔ جیسا کہ ایک مقام پر لکھا ہے کہ ؎

نقش ہے دل پہ میرے مصرعۂ صاحب
کیا ہوا بات ہماری جو نہ مانے بہزاد

اورنگ آباد سے برہان پور منتقل ہونے کے وقت بھی شفیق کے لیے ایک مصرعہ کہہ کر رخصت ہوئے ع

دولت کو دل سے اپنے صاحب نہ بھول جانا

آپ کا کلام صاف، سلیس ہے۔ فارسی شعر گوئی کا پتہ نہیں کہ ذوق سخن تھا یا نہیں۔

۶۔ داغ اورنگ آبادی

لالہ نہال کرن داغ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ لچھمی نرائن شفیق سے دوستانہ

۱۔ محبوب الزمن ص ۳۱۹
۲۔ " " ص ۴۲۱

روابط تھے جس کا ذکر خود شفیق نے "چمنستان شعرا"[1] میں کیا ہے۔ وہ پہلے رفعت تخلص استعمال کرتے تھے اور ان کے والد کا تخلص لالہ تھا۔ شفیق نے ان سے کہا کہ لالہ کی مناسبت سے رفعت تخلص مناسب نہیں ہے۔ داغ تخلص کر لیجئے کیونکہ داغ لالہ سے مناسب ہے کیونکہ ؎

لالہ را نازم کہ او با داغ می روید ز خاک
خاک بادا بر سر عشقی کہ مادر زاد نیست

شفیق کے کہنے پر انھوں نے اپنا تخلص بدل کر داغ کر لیا۔ داغ کی شاعری میں تازہ مضامین اور نئے نئے معانی کی ایجاد خاص اہمیت کی حامل ہے۔ وہ اردو فارسی دونوں میں ذوق سخن رکھتے تھے۔ اردو کلام کا نمونہ "محبوب الزمن" میں دیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا فارسی کلام کہیں دستیاب نہیں ہوا۔

۷۔ سراج اورنگ آبادی سید سراج الدین حسینی سراج نہایت مشہور و معروف شعرا میں شامل ہیں۔ اگرچہ وہ شفیق سے عمر میں بڑے تھے پھر بھی ان سے شفیق کے قریبی روابط تھے۔ انھوں نے درویشی اختیار کر لی تھی اور خواجہ سید شاہ عبد الرحمن چشتی کے مرید تھے۔ آپ کے فارسی کلام میں محاورے، سلاست اور برجستگی کا عنصر پایا جاتا ہے جس سے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آپ اہل زبان نہیں ہیں اگرچہ ان کی مادری زبان فارسی نہیں تھی پھر بھی اتنا عبور تھا کہ اہل زبان کی طرح فارسی اشعار نظم کرتے تھے۔ عبد الجبار[2] خاں صاحب نے آپ کے معاصرین

[1] بحوالہ "محبوب الزمن" ص ۴۳۲

[2] محبوب الزمن ص ۴۸۵-۴۸۷

میں شفیق کا نام لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ لچھمی نرائن شفیق سے بے حد محبت و خلوص رکھتے تھے۔ ایک روز شفیق سے آزاد بلگرامی کے اس شعر میں "رم کردن پری از آئینہ" کی سند طلب کی

صد رنگ وحشت است پری را رم ز آئینہ
دلہا چرا ارادہ تسخیر می کنند (آزاد)

شفیق نے سند کے طور پر خاقانی کا یہ شعر پیش کیا جس سے آپ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ آج ہم کو یہ فائدہ حاصل ہوا۔

ساقی بزم چوں پری جام بکف چو آئینہ
او بزمرز جام اگر ز آئینہ می رمد پری (خاقانی)

۱۱۷۷ھ میں سراج کی شمع ہستی خاموش ہو گئی تھی۔ شعرا نے قطعات تاریخ وفات کہے جن میں تمیز دکا بلگرامی اور میر آزاد شامل ہیں۔ لچھمی نرائن شفیق نے یہ قطعہ تاریخ وفات کہا

سید حق پرست معنی سنج
کہ ازو یافت شعر حسن رواج
سال فوتش شفیق کرد رقم
رو بر جہاں نمود شاہ سراج
۱۱۷۷ھ

شاہ سراج اردو و فارسی دونوں میں ذوق سخن رکھتے تھے اور دونوں میں مرتبہ کمال کو پہونچے ہوئے تھے۔ یہاں ان کے فارسی کلام کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔

جلوۂ دوست سر از پردہ کشیدم دیدم
انچہ از نغمۂ عشاق شنیدم دیدم
گل بے رنگ حقیقت کہ بدامانم بود
ہم چو اشک از مژہ خویش چکیدم دیدم
دانہ ساں ریشۂ سر سبزی من دامن بود
خاک کردیم از خاک دمیدم دیدم

رباعی

اے آں کہ بہار گلشنِ امکانی　　در پردہ نہال بصورت انسانی
با ذات احد توی صفاتِ احمدؐ　　جاں را بدنی و ہم بدن را جانی

۸۔ طپش نذر آبادی طپش نذر آبادی کا نام میر اکبر طپش تھا ان کے اجداد بدخشاں[1] سے شاہزادہ شاہ رخ مرزا کے ہمراہ ہندوستان آئے اور شاہی خدمت پر سرفراز ہوئے۔ میر عبدالقادر مہربان اور شفیق سے قریبی تعلقات تھے۔ طپش اردو و فارسی دونوں میں مشقِ سخن کرتے تھے۔ فارسی دیوان قریب چھ ہزار پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۱۹۲ھ میں آپ کی شمع حیات گل ہو گئی۔

۹۔ عاشق اکبر آبادی میر قاسم خاں عاشق سلطنتِ آصفیہ کے ملازمین میں تھے۔ شفیق سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اردو فارسی دونوں میں ذوقِ سخن تھا۔ سنہ ۱۱۸۱ھ میں انتقال کیا۔ فارسی نمونۂ کلام کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

[1] محبوب الزمن صفحہ ۴۸۵-۴۸۴

ہر سال در بہار بکسب شرف جنوں
آید برہنہ پا بہ طوافِ دماغ ما

۱۰۔ فقیر اورنگ آبادی میر ہاشم نام اور فقیر تخلص، شفیق کے دوستوں میں تھے۔ ان کی فارسی شعرگوئی کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ فارسی شعر کہتے تھے یا نہیں جس کی وجہ سے ان کے حالات نہیں دئے جا رہے ہیں۔

۱۱۔ فتوت اورنگ آبادی مستعد خاں فتوت نے ابتدا میں اپنے والد ملقب بہ اقتدار الدولہ سیف جنگ سے کتب درسی کی تعلیم حاصل کی اور پھر علمائے اورنگ آباد سے علوم کی تکمیل کی۔ سلطنت آصفیہ سے منسلک ہوئے۔ انشا نویسی اور شعرگوئی میں مہارت حاصل کی۔ لچھمی نرائن[1] شفیق گل رعنا میں لکھتے ہیں کہ "آصف جاہ ثانی کے طلب کرنے پر جب میں اورنگ آباد سے حیدر آباد آیا تو مستعد خاں فتوت سے ملاقات ہوئی نہایت اخلاق سے ملے چونکہ ہمارے درمیان موزونیت اور سخن سنجی کا تعلق تھا اس وجہ سے باہم موافقت و صحبت ہوئی۔ اکثر میں ان کے دولت خانے پر جایا کرتا تھا اور وہ کبھی میرے غریب خانے پر آتے تھے، صائب تبریزی کا دیوان اکثر ان کے مطالعہ میں رہتا تھا۔ ایک روز دیوان دیکھ رہے تھے کہ ایک غزل نکلی جس کا مطلع تھا ؎

بت اگر بت گر نما یدہ ہر زماں حاصل زنگ
من بتے دارم کہ او ہر دم تراشد دل زنگ

[1] بحوالہ محبوب الزمن صفحہ ۹۳-۹۲

فتوت نے مجھ سے کہا کہ یہ زمین مشکل ہے اگر اس میں فکر کریں طبع آزمائی ہوگی۔ میں نے اسی دن ایک غزل موزوں کی جس میں سترہ شعر تھے اور میر اولاد محمد ذکا بلگرامی نے بھی اورنگ آباد سے لکھ کر بھیجی لیکن فتوت نے اس زمین میں غزل نہیں کہی" شفیق اور ذکا کی غزلوں کے منتخب اشعار دئے جا رہے ہیں۔

از غزل شفیق

می ستاند اعتقاد آخر مراد دل زسنگ
برہمن مقصود خود را می کند حاصل زسنگ

حرف و صوتی نیست گر ہنگامہ ساز انجمن
یک قلم گویا تراشید ند آں محفل زسنگ

ناقصاں را سختی دوراں بہ اصلاح آورد
آب تیغ کند آخر می شود کامل زسنگ

سخت حیرانم کہ می گردد چساں صحبت برار
منکہ دارم دل نمی دانا او کہ دارد دل زسنگ

از غزل ذکا بلگرامی

نیست از بس دل طپیدن ہا پسند قاتلم
می نہد بارگراں بر سینۂ بسمل زسنگ

در عدالت خانۂ حکام سرکار جنوں
دائی میرانے کہ وزن او نشد کامل زسنگ

می شود بے شبہ مخصوص سر اصحاب فیل
ہر بلائے را کہ ساز د آسماں نازل زسنگ

کار فرمائی کہ باشد بے زباں ہیچ است
سعی خوب چوں کوہ کن ناحق مکن باطل زسنگ

فتوت خوش مزاج اور ظریف الطبع تھا۔ علوم و فنون میں مہارت حاصل تھی سنہ ۱۱۸۱ھ میں انتقال کیا۔ لچھمی نرائن شفیق نے تاریخ رحلت کہی۔

مستعد خاں امیر دانشمند ۔۔۔ نیر بالانشیں بزم سخن
سال فوتش شفیق کرد رقم ۔۔۔ ہائی از فوت مستعد زمن

آپ کے نمونہ کلام کے طور پر صرف ایک شعر مل سکا ہے وہ درج کیا جا رہا ہے[1]

اے موتراش دست تو باشد بریدنی
اصلاح کردہ خط پروردگار را

۱۲۔ کلاں اورنگ آبادی میر کلاں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے سن شعور سے شعر گوئی کا شوق تھا میر علی اکبر رمال فرخ آبادی سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ شفیق سے دوستانہ روابط تھے اور سلطنت آصفیہ کے ملازم تھے۔ اردو شعر گوئی کے بارے میں معلوم ہوا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے یا نہیں اس بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

۱۳۔ مقصود اورنگ آبادی میر مقصود علی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے شفیق سے دوستانہ تعلقات تھے فارسی شعر گوئی کے متعلق پتہ نہیں چل سکا البتہ اردو شاعری میں مہارت حاصل تھی۔ سنہ ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا۔

[1] محبوب الزمن صفحہ ۸۹۳

۱۴۔ مہتاب اورنگ آبادی موہن لال مہتاب اورنگ آباد میں[1] پیدا ہوئے۔[2] شفیق کے سررشتہ میں منشی کے عہدہ پر ملازم تھے۔ خوش نویسی اور انشاء پردازی میں بہت شہرت حاصل کی۔ اردو و فارسی دونوں میں طبع آزمائی کی۔ ۱۲۰۲ھ میں انتقال کیا۔ فارسی شعرگوئی کی طرف اردو کے مقابل میلان بڑا کم تھا۔ فارسی نمونہ کلام دستیاب نہیں ہوسکا۔ اردو کلام سے دو اشعار ملے ہیں لیکن ہمارا مقصد فارسی شاعری سے ہے اس لیے وہ اشعار درج نہیں کئے جارہے ہیں۔

۱۵۔ مبتلا اورنگ آبادی الفت خاں مبتلا اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ شفیق سے قریبی روابط تھے۔ فارسی شعرگوئی کے بارے میں معلوم نہیں ذوق سخن تھا یا نہیں بارھویں صدی ہجری کے آخر میں انتقال کیا۔ اردو شاعری میں بہت مشہور تھے اور سلطنت آصفیہ[3] کے ملازم تھے۔

۱۶۔ مہر اورنگ آبادی مہر علی مہر کو کمسنی[4] سے شعرگوئی کا شوق تھا جس میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ مرزا محمدی بیگ مرزا سے شرف تلمذ تھا اور شفیق سے دوستانہ روابط تھے۔ ۱۱۷۰ھ

---

[1] محبوب الزمن ص۱۰۱۷
[2] بہار سخن ص۳۴۷
[3] محبوب الزمن ص۱۰۱۹
[4] ،، ص۱۰۲۰

میں انتقال کیا۔

۱۷۔ نادر اورنگ آبادی شیخ نورالدین[1] اورنگ آباد کے مشائخ صوفیہ میں تھے۔ پڑھا لکھا اور فارسی میں اچھی استعداد تھی۔ شفیق سے دوستانہ روابط تھے۔ فارسی شعرگوئی میں مہارت تھی۔ اردو اشعار بہت کہے ہیں۔ ۱۲۰۱ھ میں انتقال کیا۔

۱۸۔ یار حیدرآبادی احمد خاں یار آصف جاہ ثانی کے عہد میں منصب پنج ہزاری پر سرفراز تھے۔ اور منور الدولہ ممتاز جنگ کے خطابات سے ممتاز تھے۔ شفیق سے دوستانہ روابط تھے اردو کے ایک شعر میں شفیق کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

اگرچہ حسب ظاہر میں جدا ہیں   ولے معنی میں ہیں یک یار و صاحب

یار نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں اور دونوں ہی میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ ۱۴ر شوال ۱۱۸۳ھ کو انتقال کیا۔

ان کا نمونہ کلام یہ ہے۔

چوں می بینم کہ جام مے بکف دلدار می آید
بلب از توبہائے خویشم استغفار می آید
برنگ قلقل مئے تازہ می سازد دماغم را
چوں آں مینا دہن در نکہت گفتار می آید

بادہ کشیم و عصیاں کشیدہ ایم
بشکن ز جام ساقی کوثر خمار ما

---

[1] محبوب الزمن ص۱۰۴۳

ملازمت شفیق صمصام الدولہ کے عہد میں منصب اور خطاب "دولت چند" سے سرفراز ہوئے۔ محبوب الزمن کے مصنف نے منصب کا نام "دولی چند" لکھا ہے۔ "دولی چند" کا منصب ان کے بھائی روپ نرائن ذہین کو ملا تھا۔ شفیق نے گل رعنا میں اپنے منصب کا نام "دولت چند" لکھا ہے اس لیے اسی کو معتبر سمجھنا چاہیے۔ گل رعنا (فصل دوم) میں انھوں نے اپنی ملازمت کے سلسلے میں یہ عبارت لکھی ہے

"در اقتدار نواب صمصام الدولہ بہادر مرحوم بہ منصب و خطاب[1]
"دولت چند" سرفراز شد"

اس کے بعد شفیق نواب نظام علی آصف جاہ ثانی کے دربار سے منسلک ہوئے اور پھر ان کے بیٹے نواب امیر احمد خاں عالی جاہ کے دربار سے منسلک رہے محمد اکبر الدین صاحب صدیقی نے "شام غریباں" میں جو مقدمہ لکھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ شفیق سنہ ۱۱۷۷ھ میں آصف جاہ ثانی کے دربار سے منسلک تھے کیونکہ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"شفیق[2] جو نظام علی خاں آصف جاہ ثانی اور پھر ان کے
بیٹے عالی جاہ کے دربار سے متوسل رہے اپنے مربی کے ساتھ سنہ ۱۱۷۷ھ
میں اورنگ آباد چھوڑ کر حیدرآباد آئے"۔

تصویر جاناں میں شاہد صاحب کے مقدمہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ حیدرآباد میں "عہدہ نظامت" پر مامور تھے۔ شاہد صاحب ان الفاظ میں رقمطراز

[1] گل رعنا (فصل دوم) ص ۹۲-۹۳

[2] شام غریباں ص ۳

ہیں کہ:-

"شفیق[1] نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے ساتھ اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل ہو گئے تھے۔ یہاں وہ عہدۂ نظارت پر مامور تھے ان کو ابتدا میں اہل حیدرآباد پسند نہ آئے چنانچہ انھوں نے ایک مثنوی میں شہر حیدرآباد کے مختلف اہل پیشہ کی ہجو لکھی ہے۔ مشائخین کے بارے میں ان کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

"پیر زادان حیدرآبادی ہمہ فرعونی اند و شدادی"

نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے فرزند نواب امیر احمد خاں عالی جاہ امیر الامرا اسد الملک اسد الدولہ نصرت جنگ بڑے علم دوست اور شاعر نواز تھے۔ خواجہ غلام حسین خاں زماں نے اپنی تاریخ گلزار آصفیہ کے ص ۹۱ پر ان کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے

"عالی جاہ بڑے علم دوست تھے ہمیشہ علما و فضلا کی صحبت گرم رہتی تھی۔ سنہ ۱۲۰۹ھ میں ان کو زہر دیا اور وفات ہوئی"۔

چار مینار سے تھوڑی دور مشرق کی طرف ایک محلہ ان ہی عالیجاہ کے نام سے "عالی جاہ کا کوٹھہ" مشہور ہے۔ اس مقام پر ان کی حویلی تھی۔ علم و فضل اور فنون لطیفہ کے قدر دان تھے۔ قدیم زمانے کی کتابوں اور تصویروں کا بیش بہا ذخیرہ انھوں نے جمع کر لیا تھا۔ تصویروں کے بارے میں انھوں نے لچھمی نرائن شفیق سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ہر تصویر سے متعلق اشعار اور نظمیں لکھ دیں چنانچہ

[1] تصویر جاناں ص ۲

عالی جاہ کے دیوان خانے میں ہر تصویر کے ساتھ شفیق کا کلام بھی آویزاں کیا گیا تھا۔[1]

مذکورہ اقتباس سے آصف جاہ ثانی اور عالی جاہ کے دربار سے منسلک ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ عالی جاہ کی مدح میں شفیق نے قصائد بھی کہے ہیں نیز شام غریباں میں شفیق کے دیباچے سے بھی عالی جاہ کے دربار سے منسلک ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ شام غریباں عالی جاہ کے نام سے معنون کی گئی ہے۔ شفیق کے الفاظ یہ ہیں۔

"امیدوارم کہ ایں متاع حقیر و سرمایہ بسیر در جناب مستطاب غرۂ ناصیہ دولت و اقبال قرۃ باصرۃ ابہت و اجلال، نص خاتم جہاں داری کوہ شاہق بردباری نیر اعظم سپہر جلالت برجیس مسند آرائے دیوان عدالت عطارد فلک دانائی مصباح انجمن روشن آرائی میر میدان صف آرائے ضرغام عرصۂ مرد آزمائی دریائے اعظم فیض رسانی سحاب مشتاق گوہر افشانی فریاد رس دادخواہاں دیہیم بخش بی کلاہاں خطش تعویذ بازوئے خستگان لطفش مومیائی دل شکستگان آئینہ نور فراست مراۃ جمال ریاست داور خلافت پناہ نواب آصف الدولہ امیر الممالک عالی جاہ مد اللہ ظلالہ و ادام دولتہ و اقبالہ درجہ پذیرائی بہم رساند۔"

مذکورہ بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شفیق صمصام الدولہ کے عہد میں

لہ شام غریباں ص ۱۶-۱۵

"دولت چند" کے عہدہ پر سرفراز ہونے کے بعد سلطنت آصفیہ سے منسلک ہو گئے اور آخر تک سلطنت آصفیہ سے منسلک رہے۔

وفات

ہر نفس کو موت سے دوچار ہوتا ہے لیکن فنکار کبھی مرتا نہیں۔ اس کے فن پارے اس کو حیات دوام بخشتے ہیں۔ جب تک فنکار کے فنی نقوش رہیں گے فنکار زندہ رہے گا

شفیق ایک فنکار تھے۔ وہ شعر گوئی میں بھی فنکار تھے نیز نثری ادب میں بھی ایک فنکار کی حیثیت سے تھے۔ ان کی رحلت ۱۲۲۳ھ میں ہوئی۔ انھوں نے ۶۵ سال کی عمر پائی۔ ان کی رحلت پر ان کے شاگرد غلام مصطفیٰ سخن اورنگ آبادی نے قطعہ تاریخ کہا ہے۔ قطعہ تاریخ میں سے صرف چار شعر دستیاب ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں مزید اشعار اور ہوں

استاد من شفیق افسوس[2] — از سپنجی سرائے فانی رفت

روئے دل از کسے نمی بینم — مایۂ لطف و مہربانی رفت

از حلاوت گذشت نظم و نثر — نمک از شعر و شعر خوانی رفت

سال رحلت رقم کرد سخن

وائے ماشطۂ معانی رفت

۱۲۲۳ھ

ان کا[2] سنہ وفات عیسوی کے حساب سے ۱۸۰۸ء ہوتا ہے۔

لہ تصویر جاناں ص ۱

کہ عماد السعادت ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء کی تصنیف ہے۔ اس حساب سے ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء قرار پاتا ہے (عماد السعادت ص ۳)

باب پنجم
شفیقؔ کے کارنامے

کارنامے

کوئی بھی ادیب ہو یا شاعر اس کی حیات کا دارومدار اس کی تصانیف یا شعری تخلیقات پر ہوتا ہے۔ جب تک اس کی تصانیف اور شعری تخلیقات صفحہ ہستی پر باقی رہیں گی اس وقت تک اس کا نام روشن رہے گا۔ یہ بات الگ ہے کہ کبھی زمانے کی ستم ظریفی سے وہ گوشۂ گمنامی کا شکار ہو جاتا ہے لیکن ایسا وقت بھی آتا ہے کہ جب وہ گوشۂ گمنامی سے نکل کر ادبی دنیا کا روشن چراغ بنتا ہے۔

شفیقؔ ایک طرف اپنی تصانیف کی وجہ سے صفحہ ادب پر جلوہ گر ہیں تو دوسری طرف شعری تخلیقات کی بنا پر ادب کی جان ہیں۔ ان کی شاعرانہ زندگی کا آغاز بارہ سال کی عمر میں ہوا جبکہ نثری ادب میں انھوں نے عمر کے اٹھارویں سال میں قدم رکھا۔ ان کے شعری کارناموں سے پہلے ان کے

نثری کارناموں پر روشنی ڈالی جا رہی ہے کیونکہ شعری تخلیقات فطری میلان طبع کا نتیجہ ہوتی ہیں اور نثری ادب ادیب کی ذاتی صلاحیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

انھوں نے نثر میں ایک طرف "تذکرہ نگار" کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا ہے تو دوسری طرف ایک مورخ کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ ان کی پہلی تصنیف "چمنستان شعرا" ہے جو در اصل اردو شعرا کا تذکرہ ہے لیکن فارسی تصانیف میں اس لیے شامل ہے کہ تذکرہ فارسی میں لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فارسی شعرا کے دو تذکرے ان کی کاوش قلم کا نتیجہ ہیں جو شام غریباں اور گل رعنا کے نام سے موسوم ہیں جن سے ان کی ادبی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تینوں تذکرے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں یہاں ان کے تذکروں کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ وہ افراد جنھوں نے اب تک ان کے تذکروں کو نہیں ملاحظہ کیا وہ بھی ان کی تذکرہ نگاری سے روشناس ہو جائیں۔ تذکروں کے جائزے کے بعد تاریخی تصانیف اور پھر شعری تخلیقات کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔ تذکروں کو اوّلیت اس لیے دی گئی ہے کہ ان کی پہلی کاوش قلم تذکرہ ہی کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ ویسے ان کی ادبی حیثیت "تذکرہ نگاری" اور تاریخ گوئی نیز شعر و سخن سبھی اصناف میں اہمیت کی حامل ہے۔

بحیثیت تذکرہ نگار

فارسی تذکرہ نگاری کا آغاز محمد عوفی کے تذکرے لباب الالباب سے ہوتا ہے[1] جو کہ سنہ ۶۱۸ھ میں ہندوستان کے قیام کے دوران لکھا گیا ہے اور

[1] تاریخ ادبیات ایران ص ۴۴۳

سنہ ۶۲۵ھ میں یہ کتاب سلطان ناصر الدین قباچہ کے وزیر حسین بن شرف الملک کے نام معنون کی۔ اس کے بعد کے تذکروں میں تذکرہ دولت شاہ سمرقندی کو اہمیت حاصل ہے۔ گیارھویں بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں ہندوستانی مصنفین نے بے شمار تذکرے لکھے جن کو شامل کیے بغیر فارسی ادب کی تاریخ نامکمل رہ جائے گی۔ ان تذکروں میں میر غلام علی آزاد کے تذکرے خزانہ عامرہ، سرو آزاد، ید بیضا، خوشگو کا سفینہ خوشگو، بھگوان داس ہندی کا سفینہ ہندی، کشن چند اخلاص کا ہمیشہ بہار، محمد صادق کا طبقات شاہجہانی، شیر خاں لودی کا مراۃ الخیال، محمد افضل سرخوش کا کلمات الشعرا، شیخ علی حزیں کا تذکرۃ المعاصرین، محمد طاہر نصر آبادی کا تذکرۂ طاہر نصر آبادی، میر حسین دوست سنبھلی کا تذکرہ حسینی، شیخ علی قانع کا مقالات الشعرا، غلام ہمدانی مصحفی کا عقد ثریا، سام مرزا کا تحفہ سامی، خوب چند ذکا کا عیار الشعرا، محمد صادق اختر کا تذکرہ آفتاب عالم تاب، عاشقی عظیم آبادی کا نشتر عشق، عبد الجبار کا محبوب الزمن، محمد صدیق حسن کا شمع انجمن حاکم بیگ لاہوری کا مردم دیدہ، قدرت اللہ گوپاموی کا نتائج الافکار اور لچھمی نرائن شفیق کے تذکرے گل رعنا اور شام غریباں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے تذکرے لکھے گئے۔ کچھ تذکرے اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں جیسے سفینہ خوشگو جس میں ہندو شعرا کا تذکرہ ہے اور شام غریباں جس میں مہاجر شعراء کے حالات ہیں نیز خزانہ عامرہ جس میں ان درباری شعرا کا تذکرہ ہے جن کو صلہ و انعام سے نوازا گیا۔

یہ کہنا حقیقت پر مبنی ہوگا کہ ہندوستانی تذکرہ نگاروں نے فارسی ادب

[1] تاریخ ادبیات ایران ص ۴۴۳

پر بہت احسان کیا اور اس کے آثارِ ادبی کی بقا کے لیے بے انتہا کوشش کی جس کی وجہ سے آج بھی اس فارسی ادبیات کے ہزاروں شعراء کے حالات اور نمونۂ کلام کا پتہ چل جاتا ہے۔ اگر ان تذکروں کو فارسی ادبیات سے الگ کر دیا جائے تو فارسی ادبیات کی تاریخ میں ایک ایسا خلا پیدا ہو جائے گا جس کا پُر کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

چمنستانِ شعراء

اس کتاب کا تعلق بحیثیت تذکرہ فارسی ادب سے نہیں ہے اس لیے کہ یہ اردو شعراء کا تذکرہ ہے لیکن تذکرہ فارسی زبان میں لکھا گیا ہے اس لیے اس کو فارسی تصانیف میں شامل کیا جا سکتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ اس میں متعدد فارسی شعراء کے بارے میں معلومات اس حیثیت سے شامل کی گئی ہیں کہ وہ اردو و فارسی دونوں زبانوں میں مشقِ سخن کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کا اردو میں مشقِ سخن اس قدر اہمیت کا حامل نہیں ہے جس قدر فارسی شعرگوئی کو اہمیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "اردو" مادری زبان ہوتے ہوئے مشقِ سخن کی گئی ہے اور فارسی مادری زبان نہ ہوتے ہوئے بھی اپنائی گئی ہے اور اس میں درجۂ کمال تک پہونچنے کی کوشش بھی کی گئی ہے اور بہت سے ہندوستانی شعراء درجۂ کمال تک پہونچنے میں کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ کچھ تو اہلِ زبان سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔

چمنستانِ شعراء شفیق کی اولین تصنیف ہے اور یہ سنہ ۱۱۷۵ھ میں جیسا کہ اس نام کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے اور شفیق خود لکھتے ہیں کہ:-

"چوں ایں تالیفِ دلکشا و تصنیفِ روح افزا در سنہ خمس

۱؎ چمنستانِ شعراء ص۲

وسبعین و مائتہ الف صورت تحریر پذیرفت و شاہد اسامی شعرا بموجب قاعدہ جمل حلیہ تسطیر در بر گرفت نام و تاریخ "چمنستان شعرا" نہادم و در بحر رکض الخیال کہ تقطیع مصرعش بچہار فعلن می شود و بنام صوت النا قوس ہم اشتہار دارد۔ قطعہ را حسن انتقاد دادم تاریخ۔

ایں نامہ باید دیدنا — کردم انشا حال فصحا
نام و تاریخش را صاحب — گفتم "چمنستان شعرا"

اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے جدت دکھائی ہے جیسا کہ مذکورہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ تذکرے حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیے جاتے ہیں لیکن اس کو حروفِ جمل کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس نئے طرزِ ترتیب کی کوئی خاص وجہ تھی یا نہیں۔ اس کا ذکر انھوں نے نہیں کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ نوجوانی کے تقاضوں کے تحت جبکہ فکر و ذہن جدت کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ایسا کیا ہو اور اس کے بعد وہ اپنی روش پر برقرار بھی نہیں رہتے اور دوسرے تذکروں میں وہ حروفِ تہجی والی روش ہی اپناتے ہیں۔

چمنستان شعراء کی اہمیت نیز شفیق کی علمی بصیرت اور ذہنی شعور پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حنیف نقوی رقمطراز ہیں کہ:-

"دکنی تذکروں میں حسنِ ترتیب اور جامعیت اور ادبی معیار کے لحاظ سے "چمنستان شعراء" کا نام سرِ فہرست ہے اس کے مولف بھی نہایت بڑے باصلاحیت اور ذی علم انسان تھے۔ اورنگ آباد جیسے گہوارہ علم و ادب سے وطنی وابستگی اور علامہ آزاد بلگرامی کے فیضانِ تربیت کی

۱؎ شعرائے اردو کے تذکرے ص۳۳۳

بدولت ان کی شخصیت کے جوہر نکھرے اور کم عمری ہی میں شعر و ادب
نیز تصنیف و تالیف سے ان کی فطری دلچسپیاں بام عروج تک
پہونچ گئیں۔"

اس کتاب کے دیباچے کی ابتدا مسلمانوں کی روش کے مطابق "بسم اللہ
الرحمٰن الرحیم" سے کی گئی ہے۔ اگرچہ شفیق مسلمان نہ تھے پھر یہ روش اس بات کا
بیّن ثبوت ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے کچھ حد تک واقفیت ضرور رکھتے تھے
ہو سکتا ہے کہ یہ شاہ ساسی اور میر آزاد بلگرامی کے فیضان تربیت کا نتیجہ ہو۔
شفیق اردو و فارسی کے ساتھ عربی استعداد بھی رکھتے تھے اور دیباچے میں انھوں
نے ایک عربی قطعہ بھی لکھا ہے اور قطعہ لکھنے کے سلسلے میں جو عبارت لکھی ہے اور
جو قطعہ منتخب کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا اور رسولؐ سے بہت متاثر
ہیں۔ ارباب بصیرت عبارت اور عربی قطعہ پڑھ کر خود نتیجہ قائم کر سکتے ہیں کہ شفیق
خدا اور رسولؐ سے کس قدر متاثر ہیں۔ اگرچہ اس بات کا ثبوت نہیں ملتا ہے
کہ انھوں نے ترک مذہب کرکے اسلام قبول کر لیا تھا پھر بھی ان کی اسلام دوستی
اور اسلامی اقدار سے متاثر ہونا ان کی تحریروں سے ثابت ہے۔ دیباچے میں
جو عبارت اور اس کے تحت عربی اشعار دیے ہیں وہ درج کیے جا رہے ہیں۔

"اگرچہ[1] برخود عقدہ کشائی و دانش آسمان پیمای ارباب
فضل و کمال پیداست کہ این فقیر را از تحریر تذکرہ مقصود بیرایاد
ستم ظریفی نیست مگر این کہ سفینہ اشعار ریختہ ترتیب باید تا استغنا
از دیگر دواوین رو نماید و احوال محبان دوستی ثمرہ کہ با راقم السطور

[1] چمنستان شعرا صـ ۳۰۲

ارتباط می دارند ہم بدین وسیلہ بقلم آید لیکن از سخن چینان لا ازین ما
کہن و حرف گیران بیہودہ سخن کہ عیب جوئی را شعار خود ساختہ اند
و نرد آہو گیر باخود باختہ و دانستہ انگشت را بر حرف قبول می نہند
و در عینک اخولی و ضلالت بر آمدہ ہمسر را بجز عیب نہ بینند
چوں بید خود می لرزد و بای دو بیت دلچسپ از طلب اللسان شدہ
تسکین بخش خاطر مضطری کردد)

"دو شعر عربی"

قیل ان الالہ ذو ولد ۔۔۔ قیل ان الرسول قد کہن
ما نجی اللہ والرسول معاً ۔۔۔ من لسان الوری فکیف انا"

اس کتاب میں شفیق نے میر تقی میر کے "نکات الشعراء" اور "تذکرہ
فتح علی خاں گردیزی" "مردم دیدہ" "مجمع النفائس" اور "سرو آزاد" کو ماخذ
قرار دیا ہے نیز اس کے علاوہ کچھ شعراء کے حالات حاجی میر اکبر علی اکبر کی زبانی
نقل کیے ہیں۔ کچھ شعراء کے حالات کے ذیل میں مصنف نے ابتدائی سطریں لکھ کر
سرو آزاد کی پوری پوری عبارت نقل کر دی ہے۔ شروع اور آخر میں اپنی مزید
معلومات کا اضافہ بھی کیا ہے اور کہیں کہیں قطعات تاریخ وفات بھی لکھے
ہیں۔ کچھ شعراء کا حال تفصیلی لکھا گیا ہے اور بعض شعراء کا مختصر حال اور نمونہ
کلام پر اکتفا کی گئی ہے جس کا سبب اطلاعات کی کمیابی کے علاوہ کچھ اور نہیں
ہو سکتا۔

اس تذکرہ میں مجموعی طور پر دو سو چودہ شعراء کا ذکر ہے جبکہ نقوی صاحب[1]

[1] شعرائے اردو کے تذکرے صـ ۳۳۶

نے لکھا کہ ۲۱۳ شعراء کا ذکر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے صرف فہرست کی تعداد
دیکھ کر لکھ دیا ہو کیونکہ فہرست میں ایک سے ۲۱۳ تک نمبر پڑے ہیں لیکن شمار
کرنے پر ۲۱۴ ہو جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نمبر ۱۶۶ دو جگہ لکھا ہے جو صرف
کتابت کی غلطی ہو سکتی ہے۔

یہ تذکرہ سراج الدین علی خاں آرزو کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور سید غلام
کے حالات پر ختم ہوتا ہے۔ تذکرے میں کہیں کہیں عبارت آرائی کی چاشنی بھی ملتی
ہے جیسا کہ وہ آرزو کے تذکرے میں لکھتے ہیں

"سر رشتہ مزاج شمع افروزی مجلس گفتگو گرم می دارد۔ در
میدان الفاظ تازہ و معانی دلچسپ قدم جستجو بسرعت می گذارد"[1]

اس تذکرے کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ شعراء کے اشعار نقل کرنے کے
ساتھ ساتھ بعض جگہ اپنی رائے بھی درج کر دی ہے اور بعض جگہ شعر کی صحت اور
درستگی پر بحث بھی کی ہے اور بعض واقعات و لطائف کا بھی بیان کیا گیا ہے۔

لالہ نہال کرن داغ کے اس شعر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :-

انتظاری سے تیری اے گل بے کیفیت   دیدۂ نرگس فناں میں بھرے ہیں جالے

"اگر بجائے "بے کیفیت" نسرین رخساری گفت است"[2] یا انھیں کے ایک دوسرے
شعر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :-

دل آج درد سر سے پژمردہ جیوں کلی ہے
شاید سخن کے سر پر دستار صندلی ہے

---

۱ چمنستان شعراء ص۶
۲ " " ص۹۵

"پیش مصراع چنیں بخاطر می رسد"
"دل کو یہ درد سر ہے کیوں یار بیکلی ہے"

یا پھر جعفر علی خاں ذکی کے اس شعر کے بارے میں لکھتے ہیں

دل میں کیا ہے سر گرہ: اب تو گرفتار ہوا   میں تو تحقیق محبت کا گنہگار ہوا

"مصرعہ اولیٰ خلاف محاورہ نکتہ چیناں است اگر چنیں می گفت خوب بود
"دل سے کیا ہے سرکھو اب تو گرفتار ہوا"

اس تذکرہ میں کہیں کہیں تحقیق سے کام لیا گیا ہے جیسا کہ جعفر علی خاں
ذکی کے ایک شعر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"فتح علی خاں[1] نوشتہ کہ "بعضے می گویند ایں شعر از ذکی
دکھنی است"۔ صاحب می گوید۔ دیوان ذکی بہ نظر در آمد ایں بیت
در و داخل نیست تحقیق کہ از ذکی است"

اس تذکرے میں ایک اور خاص بات نظر آتی ہے کہ بعض اشعار بطور ضمیمہ
لکھے گئے اور اس سلسلے میں لکھا گیا ہے کہ بعض شعراء میں اشتراک تخلص کی بنا
پر مغالطہ ہو جاتا ہے مثلاً میر محمد میر و میر تقی میر اور لوگ میر تقی میر کے شعر کو میر
محمد میر کے نام سے منسوب کرتے اور میر محمد میر کے شعر کو میر تقی میر کے نام سے منسوب
کرتے ہیں یا اسی طرح دوسرے شعراء میں۔ اس لیے ان اشعار کو آخر میں بطور ضمیمہ
لکھا گیا ہے۔

گل رعنا یہ فارسی شعراء کا تذکرہ ہے جس کو مصنف نے دو فصلوں پر تقسیم
کیا ہے۔ پہلی فصل "شعرائے اسلامیاں" اور فصل دوم "نکتہ

---

۱ چمنستان شعراء ص۱۱۹

پروانزان اصنامیاں" پر مشتمل ہے۔ یہ تذکرہ ۱۱۸۱ھ میں مرتب کیا گیا جیسا کہ شاہد صاحب نے تصویر جاناں کے مقدمہ میں بیان کیا ہے لیکن یہ کتاب ۱۱۸۲ھ میں مکمل ہوئی کیونکہ فصل دوم کے خاتمہ پر شفیق نے یہ قطعہ تاریخ درج کیا ہے ؂

ایں کتاب بہ مناقب شعرا	بچہ اسلوب تازہ شد مرقوم
از پے ختم ایں صحیفہ شفیق	گفت تاریخ "نامہ مختوم"

۱۱۸۲ھ

گل رعنا فصل اول دستیاب نہ ہوسکی اس لیے مکمل طور پر نہیں لکھا جا سکتا کہ اس میں کتنے شعرا کا تذکرہ ہے البتہ مولانا عبدالحق صاحب کے مقدمہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تذکرہ[1] "شام غریباں" سے بہت بڑا ہے اور اکثر شعرا کے مفصل حالات بیان کئے گئے ہیں۔ آزاد بلگرامی کا تذکرہ تفصیلی ہے اور اکبر کا حال ۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ شام غریباں کے مقابل اس میں لطائف و واقعات بھی زیادہ ہیں بعض مقامات پر اشعار کی شرح بھی لکھی گئی ہے اور ان کے نکات کی وضاحت بھی اور تلمیحات و اصطلاحات کی شرح بھی لکھ دی گئی ہے۔

گل رعنا فصل دوم جو دستیاب ہوسکی ہے اس میں ۴۵ ہندو شعراء کا حال درج ہے جس کی ابتدا اچل داس اچل جہاں آبادی کے ذکر سے ہوتی ہے اور آخر میں گیان چند ہنر کا تذکرہ ہے۔ شفیق کے دیگر تذکروں کی طرح اس میں بھی تاریخ وفات اور قطعات تاریخ وغیرہ لکھے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ کتاب ۱۱۸۲ھ میں مکمل

[1] گل رعنا فصل دوم ص ۱۸۸

[2] چمنستان شعرا ص ۱۱

ہوگئی تھی لیکن ۱۱۹۰ھ تک اس میں ترمیمات کی نشان دہی ملتی ہے جیسا کہ گیان رائے ہنر شاہ جہاں آبادی کی تاریخ وفات ملتی ہے جس میں درج کیا گیا ہے کہ صحیفہ کی تکمیل کے بعد ان کا انتقال ۱۱۹۰ھ میں ہوا اور قطعہ تاریخ شفیق نے کہا جو اس میں درج کیا گیا یا پھر رام نرائن موزوں کی تاریخ وفات مع قطعہ تاریخ از شفیق ۱۱۸۷ھ بھی اس امر کی نشان دہی کرتی ہے اور قطعہ تاریخ سے پہلے یہ عبارت بھی درج ہے۔

"بعد اتمام گل رعنا راجہ موزوں در عظیم آباد در حالت صوبہ داری انجا کوت ثانی سنہ سبع و ثمانین مائتہ و الف ۱۱۸۷ھ فوت شد۔"

اس کتاب میں چمنستان شعراء کی طرح عبارت آرائی نہیں کی گئی ہے۔ عبارت سلیس و سادہ ہے۔ زبان و بیان کی روانی ہے۔ الفاظ موزوں اور رواں ہیں البتہ چند شعرا کے تخلص کی مناسبت سے جو جملے درج کئے گئے ہیں وہ عبارت کی لطافت میں زیادتی پیدا کرتے ہیں۔ جیسا کہ اخلاص جہاں آبادی کے ذیل میں لکھتے ہیں "اخلاص مند خوباں معانی است" یا پھر برہمن لاہوری کے ذکر میں ناقوس نواز بت خانۂ سخن است و بید خواں صنم کدہ ایں فن" اور بہار دہلوی کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ "بہار گلستاں سخن است و آبیار سردستان ایں چمن"

اس کتاب کے دیباچے میں شفیق لکھتے ہیں کہ:۔

"اشخاص بسیاری از قوم ہنود استعداد سخن سنجی بہم رسانیدند و طوطیان سبزہ زار ہند شکر تازہ چشانیدند چنانچہ از مطالعہ ایں صحیفہ حالات

[1] گل رعنا (فصل دوم) ص ۱۹۴

این جماعت پیرایۂ وضوع خواہد یافت وچوں جمیع حروف این فصل
پیدا نہ شد ہر قدر کہ بہم رسید صورت تحریر می پزیرد"

ہندو شعرائے فارسی کی تعداد بہت زیادہ ہے اور صرف سفینۂ خوشگو میں ۲۴۵
ہندو شاعروں کا تذکرہ ہے اس لیے صرف ۴۵ شعرار کا تذکرہ مکمل نہیں کہا جا سکتا
لیکن شفیق نے خود دیباچہ میں اس کی وضاحت کر دی ہے حالاں کہ حوالہ جات سے
معلوم ہوتا ہے کہ سفینۂ خوشگو شفیق کے پیش نظر تھا پھر بھی اتنے کم شعرار کا تذکرہ
کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ان کو چاہیئے تھا کہ اس میں کچھ محنت اور برداشت
کر لیتے اور ہندو شعرار کا مکمل تذکرہ اس میں شامل کرتے جتنے شعرار کے حالات دستیاب
نہ ہو سکتے ان کی تو مجبوری تھی جس کی وجہ سے ادبی دنیا میں اس کی اہمیت بھی بڑھ
سکتی تھی۔

شامِ غریباں

یہ تذکرہ نوعیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے کیونکہ اس میں ایرانی
مہاجر شعرار کا تذکرہ ہے۔ وہ لوگ جو ترک وطن کرکے
ہندستان آگئے اور یہیں وفات پائی صرف انھیں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہندوستانی
نژاد شعرار کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس میں ۴۸۳ شعرار کا تذکرہ ہے اگرچہ یہ نہیں کہا
جا سکتا کہ تمام مہاجر شعرار کا ذکر آگیا ہے اس لیے کہ صرف اکبر[1] کے عہد حکومت
میں ۱۰۲ شعرار کے ہندوستان آنے کا پتہ چلتا ہے اس لیے ممکن ہے کہ مہاجر شعرار کی
تعداد اس سے زیادہ ہو لیکن پھر بھی یہ ضرور ہے کہ جن شعرار کی بابت معلوم ہو سکا
کہ اس کا اندراج کیا گیا اور اس میں کافی تحقیق و جستجو سے بھی کام لیا گیا ہے۔ کچھ
کے حالات تو تفصیلی ہیں اور کچھ کے بہت مختصر۔ یہ روش تقریباً ہر تذکرہ نگار کی

[1] بزم تیموریہ صفحہ ۹۷

تحریروں میں ملتی ہے اس لیے تذکرہ نگار کو جن کے بارے میں زیادہ اطلاعات مل
گئیں انھوں نے درج کر دیں۔ جس کے بارے میں کم معلوم ہو سکا اس کے حالات
لامحالہ کم لکھنا ہی پڑے۔ اس تذکرے کے آخر میں میر آزاد کے حالات تبرکاً یا عقیدتاً
لکھ دئے گئے ہیں۔ میر آزاد کے حالات و نمونۂ کلام کے بعد شفیق نے اپنے مختصر حالات
لکھے اور نمونۂ کلام کے طور پر اپنے کچھ اشعار اور مخمس کے کچھ بند لکھے ہیں اور اسی
کے ساتھ خاتمہ بھی لکھا گیا ہے۔

مہاجر شعراء کے اگر حالات و اشعار کی تلاش کی جائے تو شام غریباں میں ذکر
شدہ کے علاوہ شاید ہی چند شعرار کا پتہ چل سکے کیونکہ شام غریباں کے مطالعہ
سے پتہ چلتا ہے کہ بہت محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے اور اس کی اہمیت کا لحاظ
خود مصنف کو بھی ہے چنانچہ وہ کتاب کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مولف[1] بقدر تتبع خود این کتاب جمع ساخت و نئی خامہ دلنواز
موافق حوصلہ خود نواخت این قدر ہست کہ باین مختصر کار مولف
بست و مقصد یکہ در دل داشت بر کرسی نشست یعنی این تذکرہ
در تخصیص واردان ہند بے انبار است و باین جہت تو الیف مولفان
دیگر ممتاز"

اس کتاب کی خصوصیات میں یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ شفیق نے شعرا
کی وفات کے سنہ بھی درج کیے ہیں اور کچھ شعراء کے قطعات تاریخہائے وفات
بھی درج کیے ہیں اور ان کی تصانیف کا بھی تذکرہ کیا ہے۔
عبارت سلیس و سادہ ہے۔ کہیں کہیں شعراء کے تخلص کی مناسبت سے

[1] شام غریباں ص ۳۲۳

عبارت آرائی بھی کی ہے جبکہ چمنستان شعرا کی عبارت مسجع ہے۔ اس کتاب کی ابتدا بھی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے ہوئی ہے اور اس کے بعد یہ قطعہ درج کیا گیا ہے ؎

یارب ز تو یافتم سخن پردازی	آموختم از لطف تو خوش آوازی
خواہم ز تو کاین شام غریباں را	دل خواہ ترا زطرۂ خوباں سازی

اس کے بعد دیباچہ کی مسجع مختصر عبارت ہے۔ یہ تذکرہ نواب عالی جاہ کے نام سے منسوب کیا گیا ہے اور دیباچہ کے آخر میں "واللہ علیٰ کل شئی قدیر بالاجابتہ الجدیرۃ" درج ہے۔

اس تذکرے کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر سے ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ حضرت آدم جنت سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ آدم کے تذکرے میں قرآن کی تفسیروں اور لغت کے مفاہیم نیز شعراء کے اشعار کو ماخذ بنایا گیا ہے۔ وہ آدم کا تذکرہ اس طرح شروع کرتے ہیں۔

"آدم[1] علیہ السلام

کنیت آنجناب ابو محمد و ابو البشر است و لقب صفی اللہ چوں از وارداں ہندوستان جنت نشان اول جناب عالی است و زبان مبارک را بگفتن شعر ہم آشنا ساختہ نام والا تاج سر کتاب و مفتاح قفل خطاب نمودہ شد"

اور اس تذکرے سے ہمیں آدم کی تاریخ پیدائش۔ از محرم کا پتہ چلتا ہے جن کو انہوں نے منجمین کے اقوال کی بنا پر لکھا ہے جیسا کہ لکھتے ہیں کہ:۔

[1] شام غریباں ص ۱۶

"منجماں[1] گویند پیدائش آدم علیہ السلام روز جمعہ دہم محرم در زمانے کہ طالع او اول درجہ جدی بود و زحل آں جا و مشتری در حوت و مریخ در حمل و قمر در اسد و آفتاب و عطارد در سنبلہ و زہرہ در میزان وسوائی آں نیز گفتہ اند"

اس کے بعد دیگر حالات اور درمیان میں ناصر علی سرہندی کے اشعار در مدح آنجناب درج ہیں۔ اور پھر ہابیل کے قتل کے واقعہ کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

"آخر[2] قابیل ہابیل را کشت آدم در آں وقت زیارت کعبہ[3] رفتہ بود۔ چوں برگشت اشجار را زرد و خشک دید و عالم را بحال خود نیافت دانست سانحہ عظمیٰ بوقوع آمدہ چوں بسرا ندیپ رسید و از قتل ہابیل اطلاع یافت بسیار گریست و مرثیہ بنظم آورد کہ ایں ابیات ازاں است

تغیرت البلاد و من علیہا	و وجہ الارض متغیر قبیح
تغیر کل ذی طعم و لون	و قل بشاشۃ الوجہ الملیح
فوا اسفا علی ہابیل ابنی	قتیلا قد تضمنۃ الضریح

ابن اثیر و جم غفیر ایں ابیات را بہ آدم علیہ السلام اسناد

[1] شام غریباں ص ۱۶

[2] " ص ۱۹

[3] یہ جملہ محل نظر ہے کیونکہ جناب آدم کی وفات کے کافی عرصہ بعد یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں کعبہ کی تعمیر ہوئی۔

کردہ اند وجمعی دیگر انکار نمودہ اند' امیر خسرو علیہ الرحمہ گوید"۔

باہمہ در اصل شاعر زادہ ایم
دل بایں محنت نہ از خود دادہ ایم

ومیرزا صائب گوید

آنکہ اول شعر گفت آدم صفی اللہ بود
طبع موزوں حجت فرزندی' آدم بود"

اس کے بعد شفیق آدم کی وفات اور حضرت شیث کی ولی عہدی کا ذکر کرتے ہوئے ان کے دفن کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"امام غزالی گوید' بعضی گویند در مکہ بر جبل ابوقبیس[۱] دفن شد وبعضی گویند در ہند بر جبل نور"

آدم علیہ السلام کے تذکرے کے بعد شعراء کا تذکرہ شروع ہوتا ہے جس کی ابتدا آذری اسفرائینی کے ذکر سے ہوتی ہے اور اختتام شاہ یقین بلخی کے ذکر پر ہوتا ہے۔ کتاب کی ترتیب عام روش کے مطابق حروف تہجی کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

شعراء کے تخلص کے اعتبار سے جو جملے لکھے ہیں وہ کافی خوبصورت ہیں اور ان سے عبارت میں لطافت پیدا ہوتی ہے جیسے آذری اسفرائینی کے لیے[۲] "آذر بت تراش سخن وآباد ساز بتکدۂ ایں فن" انیسی ارشاملو کے لیے[۳] "سخن آفرین یگانہ است

۱ شام غریباں ص ۱۹
۲ " ص ۲۰-۱۹
۳ " ص ۲۸

وانیس معانی بیگانہ" اقدس شوستری کے لیے" صاحب[۱] طبع اقدس است ونکتہ فہم معنی رس" دانش کے لیے" اشعارش جواہر[۲] خزانہ دانش است وافکارش کحل الجواہر دیدہ بینش" نادری سمرقندی کے لیے" از نوادر[۳] روزگار و در فضیلت شاعری صاحب اقتدار بود"

اس تذکرے میں بھی چمنستان شعراء کی طرح بعض جگہ فن عروض کے متعلق بحث کی گئی ہے اور آخر میں اپنی رائے بھی پیش کر دی گئی ہے جیسا کہ ملا حیدر کلوچ ہری کے ایک شعر کے متعلق ؎

بہر غزل غم دل شرح می دہد حیدر
بہ گفتگوی غم آں غزال می گذرانم"

رقم طراز ہیں کہ:-

"میر آزاد فرمودند[۴] کہ ایں بحر مجتث مثمن مجنوں است کہ مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلاتن دو بار باشد تا ضم جزو آخیر مصراع اول مقطوع کہ آں را در اصلاح عروضیاں عروض گویند مقطوع آوردہ یعنی تن را از فعلاتن محذوف وعین را ساکن کردہ بجائے فعلاتن فعلن وبسکون عین آوردہ کہ در مقابل آں لفظ حیدر افتادہ برخلاف مصاریع سایر غزل را عاریض آں فعلاتن است جمع فعلاتن فعلن

۱ شام غریباں ص ۴۲
۲ " ص ۱۵۲
۳ " ص ۲۶۳
۴ " ص ۷۷-۷۶

جائز نیست اگر چنین گفت درست می شود۔

بہر غزل عمر خود شرح می دہم ہمہ حیدر

اما تنہا تقصیر حیدر نیست بیاری از صنادید شعراء دریں بحر غوطہ خوردہ اند"

ان مباحث سے شفیق کی مہارت فن اور تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شفیق علم رمل میں ماہر تھے کیونکہ وہ خود میر معصوم تسلی کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مانند[1] راقم السطور مہارتی در علم رمل داشت"

یہ تذکرہ شفیق کے دوسرے تذکروں کی بہ نسبت زیادہ اہمیت کا حامل ہے کتاب کے خاتمہ میں یہ قطعہ تاریخ درج ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ۱۱۹۷ھ کی تصنیف ہے۔

"خدارا[2] شکر کز کلک بیانم — بخوبی رو نمود انجام نسخہ
شفیق از ہاتفی تاریخ پرسید — برائے ختم گفت اتمام نسخہ"

۱۱۹۷ھ

تحفۃ الاحباب شام غریباں[3] کے مقدمہ سے معلوم ہوا کہ یوسف علی خاں نے مآثر آصفی پر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے پی ایچ ڈی کی ہے اور اپنے مقالے میں تحفۃ الاحباب کا پتہ چلایا ہے۔ اس کو

۱ شام غریباں ص ۶۶
۲ " ص ۲۲۳
۳ مقدمہ از محمد اکبر الدین ص ۳

تذکروں میں اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ سرپو استو[1] صاحب نے تحفۃ الاحباب کو تذکروں کے ذیل میں لکھا ہے۔ اب تک اس کتاب کے متعلق مزید معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔

تذکرہ گرونانک محبوب الزمن فی تذکرہ شعرائے دکن سے معلوم ہوا کہ تذکرہ گرونانک شفیق کی تصنیف ہے۔ نام سے ظاہر ہے کہ گرونانک جی کا تذکرہ ہوگا۔ دیگر معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

"بحیثیت مورخ"

تاریخی کتب اہمیت کے لحاظ سے بلند مرتبہ رکھتی ہیں۔ اگر ان کتابوں کا وجود نہ ہو تو ماضی کی تاریخ معلوم نہ ہو سکے۔ تاریخی کتابوں کے ذریعہ ہی سے ماضی کے حالات واقعات، شہنشاہوں کے کارنامے، ظلم واستبداد، شجاعت و دلیری، رسم و رواج رہن سہن اور نہ جانے کتنی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مورخین کے قلم کو آزادی حاصل ہونا چاہیے کبھی اگرچہ ظالم شہنشاہوں نے مورخین کے قلم کو اپنا پابند بنانا چاہا اور بہت سی تاریخیں حقیقت کے برخلاف وجود میں آئیں پھر بھی ان ہی شہنشاہوں کے خدمت گزار مورخین کے قلم سے کسی نہ کسی عنوان سے کسی نہ کسی جگہ تحریر ہوگئیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ حق سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔

لیکن حکومت کے پابند اور بیچ مورخین کے علاوہ باقی مورخین کی کتابیں آزادی فکر کی آئینہ دار ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ آقاؤں کی دلجوئی کے لیے ان کے

۱ نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان ص ۱۴۲

القاب و آداب ضرورت سے زیادہ لکھ دیے گئے۔

شفیق ایک مورخ کی حیثیت سے کبھی سامنے آتے ہیں لیکن وہ ایسے دور میں نہیں تھے جب مورخین کے قلم مجبور تھے اور آزادی سے واقعات کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے تھے اس لیے ان کی کتابوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

تنمیق شگرف

یہ کتاب سنہ ۱۲۰۰ھ میں تصنیف ہوئی۔ نام تاریخی ہے[1]۔ یہ کتاب دراصل دکن کی تاریخ ہے جس میں مختلف صوبوں کے جغرافیائی اور تاریخی حالات نیز اعداد و شمار کا اندراج ہے۔ اس کے بعد سلاطین کے حالات دیے گئے ہیں جس کا ماخذ تاریخ فرشتہ کو قرار دیا گیا ہے۔ سلطنت بہمنیہ کے زوال کے بعد قائم ہونے والی حکومتیں عادل شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی، قطب شاہی، برید شاہی نیز خاندیس کے فاروقی سلاطین کے مختصر واقعات درج ہیں۔ یہ کتاب حیدر آباد کے ریذیڈنٹ رچرڈ جانسن کے نام سے معنون کی گئی ہے۔ کتاب دستیاب نہیں ہوسکی اس لیے اس پر مزید نہیں لکھا جا سکا۔

حقیقت ہای ہندوستان

یہ کتاب سنہ ۱۲۰۴ھ کی تصنیف ہے مولانا عبدالحق[2] نے اپنے مقدمہ میں اس کتاب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ہم اسے من و عن درج کر رہے ہیں۔

"شفیق اس کتاب کی حقیقت دیباچے میں اس طرح لکھتے ہیں کہ:

[1] چمنستان شعراء (مقدمہ عبدالحق) ص ۹

[2] " " ص ۹-۸

"راقم[1] کے والد رائے منسارام نے جو چار پشت سے نمک خوار خاندان آصفی ہیں سنہ ۱۲۰۴ھ میں اورنگ آباد سے فردوں کے چند طباق میرے پاس بھیجے۔ یہ میرے جد ماجد کے لکھے ہوئے تھے جو سرکار حضرت کلاں علیہ المغفرۃ والرضوان میں خدمت مستوفی گری اور پیشکاری صدارت اممکنۂ ہندوستان پر فائز تھے۔ یہ فردیں نواب مغفرت مآب نظام الملک کے دستخط سے مزین تھیں لیکن ان میں بعض بوسیدہ ہوگئی تھیں اور اکثر کرم خوردہ تھیں۔ ان فردوں میں قدیم زمانے کے مختلف سنین سے سنہ ۱۱۳۹ھ تک کے مداخل و مخارج و جمعیت سپاہ وغیرہ کا حساب بطور سیاق و اصطلاح اہل جرائد میں درج تھے۔ ان سب کو سادہ عبارت میں تحریر کیا اور رقمی اعداد کو الفاظ میں لکھا۔ اس کے علاوہ دوسری معلومات بھی فراہم کر کے مناسب مقامات پر اضافہ کیا۔"

یہ کتاب شفیق نے اس وقت کے ریذیڈنٹ کپتان ولیم پیٹرک کے لیے تالیف کی کتاب کے نام سے اس کا سنہ تالیف سنہ ۱۲۰۴ھ نکلتا ہے۔ اس میں چار مقالے ہیں۔

مقالہ اول میں دفتر قدیمہ کی فردوں کی کیفیت ہے۔

مقالہ دوم میں صوبہ ہائے ہندوستان کا حال ہے۔

مقالہ سوم میں صوبجات دکن کا ذکر ہے۔

[1] مولانا موصوف کا طرز عمل رہا ہے کہ وہ عبارت کا ترجمہ لکھنے میں اصل عبارت نہیں لکھتے ان کی تحریر سے یہ بات ثابت ہے۔

مقالہ چہارم میں مسلمان سلاطین ہند کا مختصر حال سلطان معزالدین سام سے لے کر شاہ عالم بادشاہ تک ہے۔

یہ کتاب اچھی خاصی ضخیم ہے اور اس میں ہر سرکار پرگنہ اور حویلی کے مداخل اور سمت اور فاصلہ درج ہے۔ ضمنی طور پر مختصر تاریخی واقعات بھی آگئے ہیں غرض یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔

مآثر آصفی یہ آصف[1] جاہ کے خاندان کے تاریخی حالات پر مشتمل ہے جس میں ان کے دادا سے لے کر ان کے بیٹے آصف جاہ ثانی تک کے حالات شامل ہیں۔ مرہٹوں کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے واقعہ کا تذکرہ ہے نیز اس وقت کے امیروں اور راجاؤں کے بھی حالات لکھے ہیں۔ اس کتاب کا سنہ تالیف ۱۲۰۸ھ ہے۔

بساط الغنائم یہ کتاب ۱۲۱۴ھ میں سر جان ملکم کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔ موصوف اس وقت حیدرآباد میں مقیم تھے۔ اس میں مرہٹوں کی تاریخ درج کی گئی ہے جس میں ابتداء سے مولف کے وقت تک کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کا ایک حصہ شفیق نے کسی مرہٹی تاریخ سے ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کا نام تاریخی ہے اور اس سے ۱۲۱۴ھ نکلتا ہے۔

حالات حیدرآباد اس کتاب میں شہر حیدرآباد کی مسجدوں، محلوں اور باغوں کے مختصر حالات کے ساتھ ساتھ بیدہ اور ورنگل کے حالات لکھے گئے ہیں۔ اور یہ کتاب بھی ۱۲۱۴ھ میں لکھی گئی ہے۔

۱؎ تاریخی کتابوں پر تبصرہ۔ مقدمہ عبدالحق و مقدمہ شاہد کی بنیاد پر لکھا گیا ہے۔

مآثر حیدری اس کتاب کے متعلق معلومات دستیاب نہ ہو سکیں البتہ سر یوا اسٹیو[1] کی تحریر سے اتنا معلوم ہوا کہ یہ کتاب سلطان حیدر علی کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

متفرق کتب تاریخی کتابوں اور تذکروں کے علاوہ کچھ کتابوں کا اور پتہ چلتا ہے جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ امرت کھنڈ۔ ۲۔ خلاصۃ الہند۔ ۳۔ سوسن دہ زبان۔ ۴۔ مرات الہند ۵۔ نخلستان۔

مذکورہ کتابوں کے بارے میں کسی طرح کی معلومات فراہم نہ ہو سکیں کہ کن موضوعات پر اور کس سنہ کی تصنیف ہیں۔ ان کے علاوہ ایک کتاب "چمنستان اشعار" کتب خانہ درگاہ یوسفین[2] حیدرآباد میں موجود ہے جو دراصل مختلف شعرا کے انتخاب کلام پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسری کتاب[3] "خرقہ صد پارہ" کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں موجود ہے جو پند و نصائح پر مشتمل ہے۔

شفیق کے مذکورہ نثری کارناموں کے جائزے کے بعد ان کے شعری کارناموں کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

بحیثیت شاعر

فارسی شاعری کا آغاز بہت پہلے ہوا ہے اور اس کا پتہ لگانا نہایت مشکل

۱؎ نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان ص ۴

۲؎ منقول از مقدمہ شام غریباں ص ۴۔۳

۳؎ " " " ص ۴۔۳

امر ہے کہ فارسی کا پہلا شاعر کون ہے اور شاعری کی ابتدا کب ہوئی۔

شعر گوئی فطری میلان طبع کا نتیجہ ہوتا ہے اس لیے یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ شاعری کا وجود زبان کے وجود سے متصل ہوتا ہے اور زبان کے وجود میں آنے کے فوراً بعد ہی شاعری کا وجود ہو جاتا ہے لیکن تاریخی کتب ابتدائی شعراء کے حالات اور نمونہ کلام کی نشان دہی کے بارے میں خاموش ہیں۔ علامہ قزوینی کی تحقیق کے مطابق بعد اسلام فارسی شاعری کے سب سے قدیم نمونہ ابن مفرغ کے یہ مصرعے ہیں جو یزید کے دور خلافت ۶۰ھ تا ۶۴ھ کے کہے جاتے ہیں۔

آب[1] است نبیذ است

عصارات زبیب است

سمیہ رو سپید است

اس کے بعد کے اولین شعراء میں ابو حفص[2] سغدی اور عباس مروزی کے حالات اور نمونہ کلام کا پتہ چلتا ہے۔

طاہری دور اور صفاری دور کے شعراء میں حنظلہ[3] بادغیسی، محمد وصیف[4] اور فیروز مشرقی نیز ابو سلیک گرگانی کے نام سرفہرست ہیں۔ سامانی دور جو فارسی ادبیات کے ارتقا کا دور تسلیم کیا جاتا ہے اس[5] میں کم از کم ۲۷ شاعروں کے حالات

---

[1] بست مقالہ قزوینی ص ۳۲

[2] تاریخ ادبیات ایران ص ۵۰

[3] " " ص ۵۱

[4] " " ص ۵۲

[5] " " ص ۵۲-۵۳

ملتے ہیں جن میں رودکی کا نام سرفہرست ہے سامانی دور کے بعد سے اب تک ہزاروں شعراء کے حالات اور کلام کا نمونہ دستیاب ہے۔ تذکرہ نگاری کے آغاز کے بعد شعراء کے حالات اور نمونۂ کلام کی دستیابی میں آسانی پیدا ہو گئی اور آج سیکڑوں تذکرے شعرا کے حالات اور نمونۂ کلام کی نشان دہی کے لیے موجود ہیں۔

فارسی میں شعر گوئی بغیر کسی وقفہ کے جاری رہی اگرچہ اس درمیان طرز شاعری میں متعدد تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سبک قدیم، سبک ہندی، سبک بازگشت اور سبک جدید اس بات کا ثبوت ہیں کہ فارسی شاعری کا طرز تبدیل ہوتا رہا۔

فارسی شاعری میں قصیدہ نگاری کی ابتدا پہلے ہوئی جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"جس[1] زمانے میں شاعری کا آغاز ہوا عرب کی شاعری ردیف قصائد پر محدود تھی اس لیے ایرانی شعراء نے بھی ان ہی کی تقلید کی۔"

فارسی شاعری میں غزل گوئی رودکی[2] کے وقت وجود میں آ چکی تھی جس کا ثبوت عنصری کے اس شعر سے مل جاتا ہے ؎

غزل رودکی وار نیکو بود　　غزلہائے من رودکی وار نیست

عہد غزنوی میں فارسی ہندوستان میں آئی اور ہندوستان میں فارسی شاعری نے اپنا رنگ جمایا اور ابتدائی دور ہی میں ہمیں فارسی کے دو بڑے ہندوستانی شاعر ابو الفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کے نام ملتے ہیں۔ مغل عہد[3] میں فارسی

---

[1] شعر العجم (جلد ۵) ص ۲

[2] " " ص ۳۵-۴۴

[3] فارسی اور ہندوستان ص ۶

ہندوستان کی سرکاری زبان بنی، جس کی وجہ سے ہندوستانیوں نے فارسی میں دلچسپی لی اور فارسی شاعری میں ہندوستانیوں نے مہارت حاصل کی اور یہ دلچسپی صرف مسلمانوں تک ہی نہیں تھی بلکہ ہندوؤں نے بھی فارسی شاعری میں بھرپور حصہ لیا اور ہندوستان میں سینکڑوں ہندو شاعر بھی پیدا ہوئے۔ اس سلسلے میں باب سوم کے تحت لکھا جا چکا ہے اس لیے یہاں اس کی تفصیلی بحث مناسب نہیں ہے۔

لچھمی نرائن شفیق کا شمار ہندوستان کی فارسی ادبیات میں بحیثیت شاعر بھی ہوتا ہے اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وہ شعر و سخن میں میر آزاد بلگرامی کے شاگرد تھے اور تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ شعر گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا شفیق کا تعلق دکن سے تھا اور دکن[1] میں فارسی پندرھویں صدی کے وسط میں عروج پا چکی تھی اور شفیق کی پیدائش اٹھارویں صدی میں ہوئی تھی اس لیے ان کو جو ماحول ملا وہ فارسی ادبیات کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور دکن میں اس وقت شعر و شاعری کی سرگرمیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ اورنگ[2] آباد میں شفیق اپنی شاعری کا رنگ جمائے ہوئے تھے۔ وہ اردو فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ دونوں زبانوں میں صاحب دیوان ہونے کے باوجود وہ گمنامی کا شکار ہو گئے اور کئی تذکرہ نگاروں نے ان کے حالات اور نمونۂ کلام نہیں لکھے۔ مجموعۂ نغز، گلشن بے خار، عقد ثریا، گلستان بے خزاں، طبقات شعرائے ہند، تذکرہ شعرائے ہندی (مصحفی) نیز دکن کی تاریخ "گلزار آصفیہ" ان کے تذکرے کے بارے میں خاموش

۱؎ دکنی بہمنی سلاطین صفحہ ۲۰

۲؎ مرقع سخن صفحہ ۶۰

ہیں ان کے علاوہ کچھ دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی ان کو نظر انداز کر دیا۔ جن تذکروں میں ان کے حالات اور نمونۂ کلام ملتے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

شمع انجمن، نتائج الافکار، تذکرہ شعرائے اورنگ آباد، محبوب الزمن، نشتر عشق، دکن میں اردو، نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان مرحوم دیدہ، بہار سخن اور اس کے علاوہ شفیق کے لکھے تذکرے شام غریباں، گل رعنا، چمنستان شعرا، کے علاوہ مقدمہ عبدالحق جو چمنستان شعراء پر لکھا گیا۔ مقدمہ محمد اکبرالدین صدیقی جو شام غریباں پر لکھا گیا اور مقدمہ حمید الدین شاہد جو تصویر جاناں پر لکھا گیا۔

مذکورہ کتابوں سے ان کے حالات اور نمونہ کلام کا پتہ چلتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دیگر تذکروں میں بھی ان کے حالات ہوں۔ مصنف محبوب الزمن نے لکھا ہے کہ:-

> "شفیق[1] صاحب ترجمہ آزاد کے ارشد تلامذہ میں ہے۔ شاعری و سخن سنجی و تاریخ نویسی و تالیف میں فرد کامل تھا۔ اس کے نتائج طبع بہت صاف شستہ و شفاف و برجستہ ہوتے ہیں۔"

حمید الدین شاہد ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:-

> "وہ بڑے پرگو شاعر تھے۔ زبان و بیان پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ وہ فن شاعری کے رموز و نکات سے بخوبی واقف تھے[2] کوئی صنف سخن ایسی نہیں جس پر شفیق نے طبع آزمائی نہ کی ہو غزل

۱؎ محبوب الزمن صفحہ ۵۸۲

۲؎ تصویر جاناں صفحہ ۳

کے علاوہ انھوں نے قصیدہ، مثنوی، واسوخت، مخمس، مثلث، رباعیات اور تضمین بھی لکھی ہیں۔

غزل گوئی حسن و عشق غزل کی جان ہے۔ علامہ شبلی غزل کی تعریف میں رقمطراز ہیں کہ:-

"عشق[1] و محبت انسان کا خمیر ہے اس لیے جہاں انسان ہے عشق بھی ہے اور چونکہ کوئی قوم شاعری سے خالی نہیں اس لیے کوئی قوم عشقیہ شاعری سے بھی خالی نہیں ہو سکتی لیکن ایران اس خصوصیت سے اور تمام ملکوں سے بڑھا ہوا ہے"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم شعرا عشق و محبت اور فراق کی کیفیتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں یہاں تک کہ حسن و عشق ان کی شاعری کا جزو اعظم ہیں۔ شفیق بھی اپنے کو اس سے مستثنیٰ نہ کر سکے بلکہ قدما کی تقلید میں یا اظہار واقعہ کے لیے انھوں نے اپنے اشعار میں اپنے دور جوانی کی عاشقی کا تذکرہ کیا ہے جس کا ثبوت ان کے اس شعر سے مل سکتا ہے۔

یاد ایامی کہ عشق نوجوانی داشتم
بر سر بازار رسوائی دکانی داشتم

وہ محبوب کی زلف میں خدا کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دلم گم شد بزلف خوب روئی
شفیق اکنوں خدا را جستجوئی

وہ شراب کا تذکرہ کرتے ہیں تو ساتھ ساتھ اپنے نفس کی کمزوری کا بھی ذکر کرتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ معشوق کا حسن اور اس کی جاذبیت توبہ کو توڑ دیتی ہے۔

[1] شعر العجم (جلد ۵) صـ ۳۴

شکست توبہ ما را بہار شد باعث
ہزار بار نوائے بہار شد باعث

خدا گواہ کہ مے را بہ لب نیا بودم
برائے مستی من چشم یار شد باعث

شراب کے تذکرے کے ساتھ وہ اشعار میں بلاغت کلام کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

رسید بادہ کشاں را نوید خوش حالی
کہ آمد ابر سیہ مدظلہ العالی

شفیق[1] کے اس شعر پہ راز اورنگ آبادی نے اعتراض کیا کہ ابر سیاہ برستا نہیں ہے بلکہ ابر سفید ترشح کرتا ہے شراب خوار ابر سفید کو چاہتے ہیں اور یہی ان کا مقصود ہے اس لیے لفظ "ابر سیہ" شراب خواروں کی خواہش کے مخالف ہے اور شفیق سے ابر سیہ کی سند چاہی کہ قدما کے کلام میں کہیں یہ استعمال ہوا ہے کہ نہیں۔ اگر ہوا ہے تو سند کے طور پہ پیش کیا جائے۔ شفیق نے اس اعتراض کے جواب میں کہا کہ ابر کو سیہ سے مقید کر کے بلحاظ رعایت و مناسبت ظل ہے اور جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ابر سیاہ نہیں برستا محض غلط ہے کیونکہ سکندر نامہ میں نظامی گنجوی لکھتے ہیں کہ:-

بہنگام سختی مشو نا امید
کہ ابر سیہ بارد آب سفید

یا پھر مرزا صائب کہتے ہیں

طاعت کند ز انکہ ندامت گناہ را
ریزش سفید می کند ابر سیاہ را

اور صائب کے کلام سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ابر سفید نہیں برستا کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ:-

گرچہ گویند باراں نیست در ابر سفید
از طراوت می چکند از پر تو مہتاب آب

[1] محبوب الزمن صـ ۲۵۳

شفیق کے کلام میں اصلاحی پہلو بھی نظر آتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر ایک صاحب بصیرت ہو اور جاہلوں میں بصیرت نہیں ہوتی وہ علم کی گہرائیوں کو اور اس کے رازوں کو نہیں سمجھ سکتے۔

نااہل راز علم بصیرت کجا بود　　　　در چشم کور خاک بہ از توتیا بود

ان کی خواہش ہے کہ ہر ایک اپنے فرض کو ادا کرے جس کا جو کام ہے اس کو پورا کرنا چاہیے۔ کوتوال کا کام خطاکاروں کی نگرانی کرنا ہے۔ ان کو کیفر کردار تک پہونچانا ہے۔ شرابیوں کو شراب خانے سے دور رکھنا ہے نہ کہ خود شراب کے نشہ میں مست ہوکر لڑکھڑانا ہے۔ کوتوال کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے۔

عسس ز شوخی مستاں خبر نمی داری　　　　کہ سوئے میکدہ ہا می روی خدا حافظ

حافظ شیرازی کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے ریاکار زاہدوں اور ملاؤں کا بھانڈا پھوڑا ہے اور ان کے کچھ شعر تو اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حافظ ریاکار زاہدوں کے متعلق یہ کہہ چکے ہیں کہ:-

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

من حال دل زاہد با خلق نخواہم گفت
کیں قصہ اگر گویم با چنگ و رباب اولیٰ

شفیق نے بھی اس سلسلے میں قلم اٹھایا ہے اور کہتے ہیں۔

چرا ز بزم من افسردہ می روی اے شیخ　　　　چو شمع کشتہ چہ دل مردہ می زی اے شیخ
بہ شد کہ پائی تو در راہ می کند لغزش　　　　مگر ز میکدہ مئے خوردہ می روی اے شیخ

بہ نوش درد شہ بادہ صاف شوز شفیق
چراغبار بدل بردہ می روی اے شیخ

اور اس خیال کو ان کے استاد آزاد بلگرامی نے اس طرح ادا کیا ہے۔

شراب خوردہ کجا می روی خدا حافظ　　　　کشادہ بند قبا می روی خدا حافظ

یہ صحیح ہے کہ وہ ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے اس لیے بت پرستی کا عنصر بھی لازمی ہے وہ پتھر سے بھی اپنی مراد حاصل کر لینے میں کوئی عیب نہیں سمجھتے۔

می ستاند اعتقاد آخر مراد دل ز سنگ　　　　برہمن مقصود خود را می کند حاصل ز سنگ

بت پرستی کے ساتھ ساتھ عشق حقیقی کا جوہر بھی ان کی شاعری میں ہے معلوم نہیں یہ جوہر عشق خود ان کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے یا استاد کا فیض ـــ

می رساند حسن مطلق رنگ ہا بیرنگ را　　　　سیر کن در پرتو خورشید تار عنکبوت

وہ بارگاہ ایزدی میں عفو کے طالب نظر آتے ہیں۔ ان کو اپنے گناہوں کا احساس بھی ہے اور گناہوں پر پشیمانی بھی لیکن وہ خدا کی رحمت سے مایوس بھی نہیں ہیں۔ وہ خدا کی بارگاہ میں معافی کے خواستگار ہیں۔

یارب بدر تو عذر خواہ آمدہ ام　　　　سر تا بقدم غرق گناہ آمدہ ام
از چشمہ عفو شست و شوی فرما　　　　در بارگہت نامہ سیاہ آمدہ ام

خالق ایزدی کی بارگاہ میں گناہوں پر پشیمان ہونا اور اس سے معافی کی خواستگاری انھوں نے نظامی گنجوی سے سیکھی ہے اسی خیال کو نظامی گنجوی اس انداز میں ادا کرتے ہیں کہ:-

عفو[1] کن عذر خواہ آمدم　　　　بدرگاہ تو روسیاہ آمدم

---

[1] سکندر نامہ ص ۷

شفیق کی یہ غزل ملاحظہ ہو جس میں سلاست، روانی، خاص طور پر نمایاں ہے اور آسان الفاظ میں تغزل کو اس خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ تغزل کے حسن میں چار چاند لگ گئے۔

گل سر سوی گشتم شانہ گردیدم صبا گشتم
بہ چندیں شیوہ گشتم تا بہ زلفش آشنا گشتم

بایں منت کہ شاید جا دہد در گوش خود جاناں
طلائی حلقہ گردیدم گہر گشتم صدا گشتم

چہ کوشش ہا کہ کردم تا گرفتم کام از آں لبہا
شراب ناب گشتم برگ پاں گشتم نوا گشتیم

نہ داد آں بے وفا رہ بردر دولت سرائی خود
عبث زنجیر گشتم حلقہ گردیدم گدا گشتم

رسید از سایہ من پادشاہ کشور خوبی
اگرچہ ابر گشتم چیز گردیدم ہما گشتم

روم تا در رکاب لیلی خود حیلہ ہا کردم
غبار راہ گشتم سایہ گردیدم درا گشتم

شفیق از اہل دنیا خواستم پہلو تہی سازم
زلال خضر گشتم کیمیا گشتم وفا گشتم

مثنوی نگاری

شفیق نے مثنوی پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی تین فارسی مثنویوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک[1] "مثنوی

۱؎ شام غریباں ص ۳

اقسام نسواں" اور دوسری "ہجویہ مثنوی" جو حیدرآباد کے مختلف [illegible] پیشہ کی ہجو میں کہی گئی تھی جس کا صرف ایک شعر دستیاب ہو سکا۔[2]

بہر زادان حیدرآبادی   ہمہ قرمحقی اندیشہ وادی

تیسری مثنوی بہ تعریف علی [illegible] نام کتاب ہے جو بہت مختصر ہے۔[3] اس سلسلے میں شفیق خود لکھتے ہیں کہ

"[illegible] تحریر [illegible] ... ستوفی یا این بزرگ دست [illegible] چوں گل رعنا وجواہر زواہر تالیف [illegible] گلہا [illegible] قدردانی حیدر [illegible] مثنوی در مدح ایں تالیف منظوم ساختہ وبندہ ہم مثنوی مختصری در مدح آں قدرشناس اہل سخن موزون کردم از آں جملہ ایں ابیات است"

مغنی بیا نغمہ آغاز کن   تہ [illegible]
[illegible] بدہ گوشمال   [illegible]
[illegible] شعر [illegible]   کہ ہم شعر فہم است ہم شعر گو
اگر نام او [illegible]   [illegible]
چوں [illegible] سخن ہای او [illegible]   [illegible]
چو [illegible]   [illegible]

۱؎ تصویر جاناں (مقدمہ) ص ۷-۶
۲؎ شام غریباں ص ۹۸
۳؎ " ص ۹۹-۹۸

مجال کجا تا بگویم سخن — سزائی ثنا گو زبان و دہن
ز تعریف من او صفت او برتر است — کجا ذرۂ خورشید را در خور است
چو فردوسی آں پیشوائی سخن — رسول سخن بل خدائی سخن
ز شہنامہ سیمی نکو نقش بست — کہ معنیش اکنوں بہ کرسی نشست

"جہاں آفریں تا جہاں آفرید
سواری چو رستم نیامد پدید"

ز رستم ہمیں رستم آمد مراد — کہ ایں قرعہ بر نام نامی افتاد
فلک چرخ زد گرد عالم بسی — ندیدہ چوں رستم علی خاں کسی
نہ بزم است چو شمع روشن بیاں — بہ رزم است چوں رستم داستاں
ز سلجوقیاں یادگار است ایں — گل نو رس آں بہار است ایں
کجا کس بایں عظم شاں می رسد — کہ اصلش بہ سلجوقیاں می رسد
نباشد چو او خوش نسب خوش نصیب — کز اجداد او ہست افراسیاب
سخاوت غلام است او را قدیم — کہ ابن الکریم است و ابن الکریم
سلامت بہ اشعار او قوام است — نزاکت بہ افکار او ہم دم است
مگر بود در فکر امداد من — کہ از شوستر آمدہ در دکن
ز اخلاق تسخیر دنیا نمود — شہنشاہی ملک دل ہا نمود
نیاورد چرخ کہن در جہاں — چو رستم علی خاں اعظم جواں
بہ تعریفیم اشعار موزوں نمود — ز راہ قدر دانیم پرستود
مرا لازم آمد ثنائی کنم — بجاں منت او را دعائی کنم
بود تا بقائے جہاں کامراں — بہ عمر ابد دولت جاوداں

چو نی خصمش از بیخ برکندہ باد
ہمہ لاغر و زار و نالندہ باد

اس مثنوی کی عبارت سلیس اور عام فہم ہے۔ روزمرّہ کا برمحل استعمال اور روانی الفاظ اس کی اہم خصوصیات ہیں۔ اس مثنوی کے ذریعہ شفیق کی مثنوی نگاری پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ مثنوی اگرچہ بزمیہ ہے لیکن اس میں بطور تضمین فردوسی کا شعر لگا کر بعد کے اشعار میں ایک انوکھا کیف پیدا کر دیا جس کی وجہ سے اس میں رزمیہ مثنوی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

اس کے علاوہ ان کی ایک اردو مثنوی بھی شائع بھی ہو چکی ہے "تصویر جاناں" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں چھ عنوان ہیں۔

۱۔ تمہید۔ ۲۔ سراپا۔ ۳۔ بیان پوشاک۔ ۴۔ بیان مقصود۔ ۵۔ نقل ۶۔ اصل قصہ

تمہیدی اشعار میں فارسی کا یہ شعر لکھا گیا ہے۔

کرا از عاشقاں ایں دست دادہ — کہ معشوقش بہ خدمت ایستادہ

بیان مقصود میں فارسی کا یہ شعر تحریر کیا گیا ہے۔

منم عاشق مرا غم سازوار است — تو معشوقی ترا با غم چہ کار است

"نقل" میں فارسی کے یہ دو اشعار متضمن کئے گئے ہیں۔

نبا ید نسبت اندر چیز کے دل — کہ دل برداشتن کاری ست مشکل
بہر کاری کہ ہمت بستہ گردد — اگر خاری بود گلدستہ گردد

اصل قصہ میں یہ شعر لکھا گیا ہے اور یہ شعر مقطع کے بعد ہے اور اس پر مثنوی کا خاتمہ ہے۔

مخاطب اند کے نازک مزاج است — سخن کم گو کہ کم گفتن رواج است

منقبت نگاری

منقبت نگاری شاعری کا ایک حصہ ہے اور تقریباً ہر شاعر نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ منقبت

شاہان وقت کی بھی کی جاتی ہے اور مذہبی پیشواؤں کی بھی۔ شفیق کی منقبت نگاری میں جو کلام ملتا ہے اس میں حاکم وقت اور اپنے سرپرست عالی جاہ[1] کی مدح کی گئی ہے لیکن یہ اردو میں ہے جس سے ہمارا مقصد وابستہ نہیں ہمارا مقصد ان کے فارسی کارناموں کا بیان ہے اس لیے اس کو شامل نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی منقبت نگاری کے بارے میں "شام غریباں" سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کتاب "جواہر زواہر" میر غلام علی آزاد کی منقبت میں منظوم تصنیف ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بارے میں معلوم نہیں ہوا غالباً ابھی یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔ شفیق میر آزاد کے حالات کے ذیل میں اس کتاب کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں کہ:۔

"مخفی[2] نماند کہ بندہ شفیق جواہر زواہر نام کتاب مشتمل
بیخ ہزار بیت در مناقب آں جناب بقید کتابت آوردہ ام ہر قدر
ترجمہ والا کہ در جواہر زواہر بہ تفصیل نوشتہ ام"

اس کتاب کے علاوہ شفیق کی ایک فارسی غزل میر آزاد کی مدح میں ملتی ہے جس کا مطلع یہ ہے

لامکان است مقام آزاد — فوق عرش است قوام آزاد

اس کے علاوہ شام غریباں میں ایک مخمس کے کچھ بند میر آزاد کی مدح میں ہیں جس کے بارے میں شفیق نے لکھا ہے کہ:۔

"راقم[3] الحروف غزل حضرت آزاد کہ در حق کو شاہ مردان واقع

[1] تصویر جاناں ص۸
[2] شام غریباں ص ۲۸۹
[3] " ص ۳۲۱

حیدرآباد فرمودہ اند مخمس کردہ الحال تراجم شعرا را برین مخمس کہ مشتمل در منقبت ولایت مآب است ختم می کنم این گفتگوی را ہمہ نواز از زبان خامہ مہر می زنم"۔

قبلہ عارفان جناب عتیق — خلف مرتضی علی التحقیق
گرد از فلک عنبرین تمیس — سحری پاگزاشتم بطریق
با جہاں دیدہ رفیق شفیق

رہ گرامی شدم بہر راہی — گہہ بہ نہری و گہہ لب چاہی
می نمودم چہ میر دل خواہی — ناگہاں رونمود درگاہی
ہمہ تعمیر او بطریق انیق

وہ چہ درگاہ مہبط انوار — آسمانی ز ثابت و سیار
خاک او سرمۂ اولی الابصار — گرد او جمع مردم اقرار
جملہ در بحر اعتقاد دو طریق

چمنی دیدہ شاد گردیدم — چوں گل نو رسیدہ خندیدم
اژدہا می ز خلق چوں دیدم — از یکی زاں گروہ پرسیدم
کایں چہ جائیست و ایں کدام فریق

اللہ جائی روح افزا است — چہ مکان مقدس و اعلیٰ ست
راست او شاہ کن یمن جاست — گفت ایں آستان شیر خدا است
گر زیارت کنی زہے توفیق

چوں نظر بر عمارتش کردم — فہم پنہاں بشارتش کردم
امتثال اشارتش کردم — پیش رفتم زیارتش کردم
اشک ہا ریختیم برنگ عقیق

خواستم از جناب شاہ مدد　　فیض اندوختم فزوں از حد
تاکند حسن اعتقادم رو　　مرد مہرہ درمواخذہ زد
گفت وی دور تر ز فکر عمیق

پور عمراں مگر بہ ہند آمد　　شیر یزداں مگر بہ ہند آمد
سر سیداں مگر بہ ہند آمد　　شاہِ مرداں مگر بہ ہند آمد
کہ تو ایں حرف را کنی تصدیق

گوش کردم چوں حرف بیہودہ　　خواستم سیلئ زنم بہ قفا
حلم من عاقبت نہ داد رسا　　بیت آز او یا زد بود مرا
خوانش عاشقانہ پیش رفیق

من کہ فائز بہ نور عرفانم　　عشق مولی است جز ایمانم
بنود احتیاج برہانم　　ہر کجا ایم او ست قربانم
عاشقاں راچہ کار با تحقیق

اس مخمس میں منقبت کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ مبالغہ آرائی منقبت کا حسن سمجھا جاتا ہے۔ اس میں مبالغہ آرائی بھی نمایاں ہے۔ نمونہ کے لیے یہ مصرع دیکھیے "خاکِ او سرمہ اولی الابصار" یا پھر "شاہ مرداں" اور "شیر یزداں" کو دیکھیے اس سے زیادہ مبالغہ آرائی ممکن نہیں ہے۔

تاریخ گوئی تاریخ گوئی بھی فن شاعری کا ایک حصہ ہے۔ اگرچہ تاریخیں نظم و نثر دونوں میں ہوتی ہیں۔ پہلے تاریخ گوئی کا عام رواج تھا۔ بچوں کے تاریخی نام رکھے جاتے تھے۔ کتابوں کی اشاعت پر "تاریخ طبع" لکھوائی جاتی تھی اور شادی بیاہ کی تاریخ نظم کی جاتی تھی اس کے علاوہ ولادت و وفات کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں۔ ہر شاعر کا تاریخ گو ہونا ضروری

بھی نہیں کیونکہ تاریخ گوئی بذات خود ایک فن ہے البتہ بہت سے شعراء تاریخیں کہتے تھے۔ مذکورہ مواقع کے علاوہ بھی جو اہم موقع آتا تھا اس کی بھی تاریخ لکھی جاتی تھی۔ جنگ میں کامیابی، امتحانات میں کامیابی نیز اہم شخصیات کی آمد پر خیر مقدم کی تاریخ لکھی جاتی تھی۔ آج کے دور میں اگرچہ تاریخ گوئی کا رواج کافی حد تک کم ہو گیا ہے پھر بھی یہ فن آج بھی زندہ ہے۔ شفیق نے بھی رسم و رواج کے مطابق تاریخیں لکھیں اور ایک حد تک وہ کامیاب تاریخ گو نظر آتے ہیں۔ یہاں ان کی تاریخ گوئی کے چند نمونے پیش کئے جا رہے ہیں

رنگین کی تاریخ وفات

سخن سنج[1] معنی گزیں خاں رنگیں　　چو شد بہر گلگشت گلزار عقبیٰ
ندا داد ہاتف پے سال فوتش　　"بمرگ مفاجات او شد ز دنیا"

۱۱۷۰ھ

نجات اورنگ آبادی کی وفات پر

قانون[2] شناس شعر و سخن بیدل　　از دار بے بقا شدہ در گلشن جناں
تاریخ فوت او بصد آہ و فغاں دلم　　گفتا "نجات یافتہ زیں بے وفا جہاں"

۱۱۷۵ھ

حاکم بیگ خاں حکیم کے گھر پر تشریف لانے کے سلسلے میں یہ قطعہ تاریخ کہا:۔

---

[1] محبوب الزمن ص ۴۵۹

[2] چمنستان شعرا ص ۲۵-۳۲۴

بکاشانہ ام کرد حاکم کرم [۱] — سرا کرد ممنون خلق کریم
پے سال تاریخ او ہاتفی — ندا داد "تشریف عبدالحکیم"

۱۱۷۵ھ

چمنستان شعراء کی تصنیف کے موقع پر یہ قطعہ تاریخ کہا

ایں نامہ را باید دیدن [۲] — کردم انشا حال فصحا
نام و تاریخش را صاحب — گفتم "چمنستان شعراء"

۱۱۷۵ھ

نئے تخلص ملنے پر یہ قطعہ تاریخ کہا

از حضرت فیض بخش آزاد [۳] — گردید مرا تخلص انعام
گفتم [۵] تاریخ ایں عنایت — امداد شفیق شد مرا نام

۱۱۷۶ھ

شاہ سراج کی وفات پر یہ قطعہ تاریخ کہا

سید حق پرست معنی سنج [۴] — کہ ازو یافتہ شعر حسن رواج
سال فوتش شفیق کرد رقم — رو بر حماں نمود شاہ سراج

۱۱۷۷ھ

---

۱ چمنستان شعراء ص ۱۷۸
۲ " ص ۱۲
۳ گل رعنا ص ۹۶
۴ مرقع سخن ص ٦
۵ چمنستان شعراء میں تیسرا مصرع اس طرح ہے "تاریخ بہ اہل بزم گفتم"

گل رعنا کی تکمیل پر یہ قطعہ تاریخ کہا

ایں کتاب مناقب شعراء [۱] — بچہ اسلوب تازہ شد مرقوم
از پے ختم ایں صحیفہ شفیق — گفت تاریخ "نامہ مختوم"

۱۱۸۲ھ

رام نرائن موزوں کے انتقال پر یہ قطعہ تاریخ کہا

تہی شد انجمن از نکتہ سنجاں [۲] — کہ راجہ رام نارائن بزد کوس
شفیق از سائلی تاریخ پرسید — بگو "موزون فائق رفت افسوس"

۱۱۸۷ھ

گیان رائے ہنر کی وفات پر یہ قطعہ تاریخ کہا

ہو ناسخ [۳] ماہ رمضاں — شاعر ماہر معنی پرداز
سال فوتش بقلم داد شفیق — کرد رحلت "ہنر بے انباز"

۱۱۹۰ھ

شام غریباں کی تکمیل پر یہ قطعہ تاریخ نظم کیا

خدارا شکر کز کلک بیانم — بخوبی ماد نمودہ انجام نسخہ
شفیق از ہاتف تاریخ پرسید — برائے ختم گفت "اتمام نسخہ"

۱۱۹۷ھ

یہ تھیں شفیق کی تاریخیں جن سے ان کی تاریخ گوئی میں مہارت

---

۱ گل رعنا ص ۱۸۱
۲ " ص ۱۸۵
۳ " ص ۱۸۵

کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے قبل غزل گوئی اور منقبت نگاری کا جائزہ پیش کیا جا چکا ہے نیز ان کی کتابوں کا جائزہ بھی دیا جا چکا اس لیے اب ان کا فارسی کلام درج کیا جا رہا ہے کیونکہ جہاں تک پتہ چلا ہے کہ ان کا دیوان ابھی شائع نہیں ہوا اس لیے جتنے اشعار دستیاب ہوئے ہیں درج کئے جا رہے ہیں اگر ان کے کلیات یا دیوان کی دستیابی ہوتی تو ان کی شاعری پر مزید لکھا جاتا۔

کلامِ شفیق

مصرعِ ابروی او بسم اللہ عنوان ما — مصحفِ رخسارہ او دین و ایمان ما
بسکہ از گفتار ما ریزندگان را رنگہا — کردہ صورت گراں شد صفحہ دیوان ما

بردل ما التفاتے ہست چشم یار را — الفتی بسیار با مینا بود بے خوار را
چشم او بر ما نگاہی گر ندارد عیب نیست — می شود پرہیز لازم مردم بیمار را
گر خود آرائی ہوس داری بشنو عرض شفیق — اندکی تحریف باید چہرہ گلنار را

فزود جلوۂ او سیل گریہ ما را — طلوع ماہ کند بیش آب دریا را
بگوش زاہد پیر این سخن مگر نہ رسید — کہ فیض عشق جواں می کند زلیخا را

صبح گاہی دید او آئینہ را — داد شکل آبرو آئینہ را
خاک ری صیقل دل می شود — خاک می سازد نکو آئینہ را
جلوۂ قدرت تماشہ کردنی است — داد آں گل، رنگ و بو آئینہ را
غیرت یکتائی او جوش زد — زد بسنگ آں تندخو آئینہ را
آتش خارا گداز حسن او — می نماید آب جو آئینہ را

والہ نقش نگار خود زبس افتادہ است — می کند تصویر خود را ہر زماں بہزاد ما

گرچہ ای دوست ندیدم چمن روی ترا وایم از باد صبای شنوم بوی ترا

کہ آنجا برود باز نگردد ہرگز ہست آئین گلستان ارم کوی ترا

بر زمین آمدہ از دور زمین بوس کند ماہ نو گر نگرد گوشہ ابروی ترا

سنبلی تازہ دترددشوم چشم ترا گرنہ بینم بچمن سنبل گیسوی ترا

خواہد از گوشہ چشمت نگہ لطف شفیق آرزوی بہ ازین نیست دعاگوی ترا

بر حجب بست لعل تو دست نبات را در تیرگی نشاند زلال حیات را

چون بت اگرچہ نرگس مست تو بستہ نیست در کار ہیچ کس نہ کنی التفات را

نہ چرخ و چار صد عدد سیزدہ بود بر نخس کردہ اند بنا کائنات را

رنجیم بوسہ از لب ہای شیرین تو می خواہم توان داد ند مرا این شربت دردمند را

تعالی اللہ چہ دولت شد میسر ناگہان امشب

کہ آمد بر سر بالین من آنجان جان امشب

ہم آغوشم بجانان طالع بیدار را نازم

مگر در خواب نوشین است چشم آسمان امشب

چون گل ریزی کہ ریزد بر زمین گلہای آتش را

مرا افتاد رخت دل ز چشم خون چکان امشب

می کند ظالم ز احسان ہم ضعیفان را خراب

در ستون سبزہ خط را دہد حلاق آب

ہم چون آن شخصی کہ گوید خواب را پیش چراغ

در شب خط با دل سوزان می دارد خطاب

آشنائی بعد مدتہا دہد کیفیتی ....

نشاء خوبی دہد چون کہنہ می گردد شراب

بیش گردد خلق جانان از شراب عطر بو افزون دہد در آفتاب

نسبت معنی بود در لفظ ہم شاہد دعوی است مد لفظ آب

سفلہ چون یا بدمروی بد شود آب گردد بے مزہ وقت سحاب

غنچہ ہا بشگفت و طفل گل عذارم برنگشت صد گریبان پارہ شد دامن سوارم برنگشت

گریہ می آید مرا بر حال خود در فصل گل گشت آب رفتہ در جو نگارم برنگشت

ہر کسی را می رسد نوبت بہ دور آسیا بر مراد خاطر من روزگارم برنگشت

سخت حیرانم چہ پیش آمد الہی خیر کن دیر شد باد صبا از کوی یارم برنگشت

گر جہان برگشت از من نیست پروایم شفیق شکر ایزد را کہ از من گل عذارم برنگشت

بزور لعل دلم بردہ و انکار است فدای ناز تو صد لعل این چہ کردار است

تو چشم را بہمہ سو افگنی و من ترسم ازین سبب کہ مزاجش علیل بیمار است

بجانب دل ما ہم تو آن نگاہی کرد ترا ہمیشہ بہ آئینہ گر سروکار است

نقد جان در عوض عشق بتان این ہمہ نیست

منفعت گر نہ دہد دست زیان این ہمہ نیست

انقلابی عجبی گردش گردوں دارد
مئی بیار دیدکہ عمر گزراں ایں ہمہ نیست

دل و دیں دادہ خریدم قدح بادۂ ناب
شکر درگاہ الہیٰ کہ گراں ایں ہمہ نیست

زاہد ایں زہد تو بیش ریائی بیش نیست
نوش باید کرد جام مئی کہ مائی بیش نیست

نیستم ناداں کہ بر امید خالی دل نہم
دیدہ ام انعام عالی مرحبائی بیش نیست

گوہر غلطاں چہ باشد تا بہ خود نازاں شود
پیش دندان تو دیدم جبہ سائی بیش نیست

چہ ستم ہا بہ دل از چشم سیہ مست تو رفت
شیشۂ تحفہ صد افسوس کہ از دست تو رفت

آہ را ضبط نہ کردی بہ تحمل اے دوست
حیف مصراع بلند از نظر پست تو رفت

مو بر آمد بہ زباں اے کمر نازک یار
درمیاں حرف چو از نیستی دہست تو رفت

دست مالیدن تو شود نہ بخشید شفیق
حیف چو رنگ حنا فصل گل از دست تو رفت

مشک غبار ما نہ شد اکسیر گو مشو
گر صندل صداع تحمل شود بس است

سوخت یا بشکست یا خوں شد نمی دانم چہ شد
شب کہ در زلف سیاہ او دل بیتاب رفت

دل من سوختہ آتش سودائی ہست
لالۂ دامن صحرائی تمنائی ہست

با سر زلف تو زنہار تقاضا نکنم
ایں قدر بس کہ دل رفتہ من جائی ہست

اگر نگاہ تو بیجا دجانت ادو بجا
کہ راہ طے نہ شود از پیادہ مستادرست

عاشق خدمت معشوق سعادت داند
بال بلبل بہ چمن مروحہ جنبان گل است

عکس خود را دید چوں در چشم من غمگیں نشست
گفت ہے ہے دلبر دیگر بہ چشم ایں نشست

می رساند حسن مطلق رنگہا بے رنگ را
سیر کن در پرتو خورشید تار عنکبوت

شفیق اکنوں خدا را شور کم کن
کہ شوخ من دریں جا مست خواب است

جز تماشائی تو ایں جا کام نیست
شہر ہائے عشق چوں بسطام نیست

یار در کاشانہ آئینہ است
دولتی در خانہ آئینہ است

مہلت عمر من و برق و شرر ہر سہ یکی است
فرصت صبح و گل و باد سحر ہر سہ یکی است

در فزون کردن زخم جگر خستهٔ من
زلف او مشک ختن سنبل تر هر سه یکی است

دل من زلف یار را رام است　　دام اقباله عجب دام است

محتسب ای تند چون این همه غوغا عبث
چشم من از گریه سرخ تهمت صهبا عبث
دل که نه برداشتم نذر کنیم از خود
ای بت کافر من بار تقاضا عبث

شکست توبهٔ ما را بهار شد باعث　　هزار بار نوای هزار شد باعث
خداگواه که می را به لب نیاورده بودم　　برای مستی من چشم یار شد باعث
دماغ رفتن کوی بتان نبود مرا　　ولی چه چارهٔ دل بی قرار شد باعث

ظالمان را باشد از روز ازل کردار کج　　هست عقرب را دم کج مار را رفتار کج
غنچه ریزد برگ می گردد نهان از روی شرم　　جامه زیب ما چو بندد در چمن دستار کج

بهار آمد و شد در چمن هوای قدح　　بیار می که دهم توبه رونمای قدح
در این بهار ز مینای دست برنمی دارم　　قسم به گردن مینا قسم به پای قدح
مرا چو سوسن اگر راه زبان شود پیدا　　خداگواه کنم صرف در ثنای قدح
ز یار باده طلب کن بوقت بارش ابر　　که مستجاب شود این زمان دعای قدح

زبسکه بیخبرم دیدم در چمن ساقی　　نمود لطف گل تر مرا بجای قدح
بکوی میکده مستی که می فتد از پای　　بلند دست کند گوید این که های قدح
سفید باد الهی چو ماه نو ز برص　　لب کسی که نه گشته است آشنای قدح

چرا ز بزم من افسرده می روی ای شیخ　　چو شمع کشته چه دل مرده می روی ای شیخ
چه شد که پای تو در راه می کند لغزش　　مگر ز میکده می خورده می روی ای شیخ
بنوش دُردِ شراب و صفا شود شفیق　　چرا غبار بدل برده می روی ای شیخ

چه باشد گر بحالم مهربان شاهی چنین باشد　　بیان حالهٔ آغوش من ماهی چنین باشد
من از دست دل خود روی آسایش نمی بینم　　کجا آرام چون در سینه بدخواهی چنین باشد
نمی گویم که بر من جور کن یا مرحمت فرما　　بقربانت روم گاهی چنان گاهی چنین باشد
به زلف عنبرینش می کنم چو شانه گستاخی　　مرا هم گر میسر دست کوتاهی چنین باشد
شفیق ما براه نیستی داد جان آخر　　توان از سر گذشتن گر سر راهی چنین باشد

پای تو رخون مژه گلفام توان کرد　　ای شوخ بهر رنگ ترا رام توان کرد
هرچند که از جور تو در سینه نفس نیست　　آهی به اسلوب سرانجام توان کرد
گر دشمن بدکیش مرا باز گذارد　　در سایهٔ دیوار تو آرام توان کرد
دست تو شفیق است تهی فصل بهاران　　پیمانه از پیر مغان وام توان کرد

چون کنم در دل خود نقش دل آرامی چند　　بر عقیقی نتوانم که کنم نامی چند
نیست معلوم که من بعد چه تدبیر کنند　　ماند در وعدهٔ آن ماه جبین شامی چند

در فزون کردن زخم جگر خستهٔ من
زلفِ او مشکِ ختن سنبل تر هر سه یکی است

دلِ من زلفِ یار دارام است دام اقبال عجب دام است

محتسب ای تند چون این همه غوغا عبث
چشم من از گریه سرخ تهمت صهبا عبث
دل که نه برداشتم نذر کنیم از خود
ای بتِ کافر من بار تقاضا عبث

شکست توبهٔ ما را بهار شد باعث هزار بار نوای هزار شد باعث
خدا گواه که می را به لب نیا بودم برای مستیٔ من چشم یار شد باعث
دماغ رفتن کوی بتان نه بود مرا ولی چه چارهٔ دلِ بی قرار شد باعث

ظالمان را باشد از روز ازل کردار کج هست عقرب را دم کج مار را رفتار کج
غنچه ریزد برگ می گردد نهان از روی شرم جامه زیب ما چو بندد در چمن دستار کج

بهار آمد و شد در چمن هوای قدح بیار می که دهم توبه رونمای قدح
درین بهار ز می دست بر نمی دارم قسم به گردن مینا قسم به پای قدح
مرا چو سوسن اگر راه زبان شود پیدا خدا گواه کنم صرف در ثنای قدح
ز یار باده طلب کن بوقت بارش ابر که مستجاب شود این زمان دعای قدح

زبسکه بی خبرم دیدم در چمن ساقی نمود لطف گلِ تر مرا بجای قدح
بکوی میکده مستی که می فتد از پای بلند دست کند گویا این که های قدح
سفید باد الهی چو ماه نو ز برص لب کسی که نه گشته است آشنای قدح

چرا ز بزم من افسرده می روی ای شیخ چو شمع کشته چه دل مرده می روی ای شیخ
چه شد که پای تو در راه می کند لغزش مگر ز میکده می خورده می روی ای شیخ
به نوش دردِ تهِ باده صفا شود شفیق چرا غبار بدل برده می روی ای شیخ

چه باشد گر بحالم مهربان شاهی چنین باشد بیان حالهٔ آغوشِ من ماهی چنین باشد
من از دستِ دلِ خود روی آسایش نمی بینم کجا آرام چون در سینه بدخواهی چنین باشد
نه می گویم که بر من جور کن یا مرحمت فرما بقربانت روم گاهی چنان گاهی چنین باشد
به زلفِ عنبرینش می کنم چو شانه گستاخی مرا هم گر میسر دست کوتاهی چنین باشد
شفیق ما براه نی سوار داد جان آخر توان از سر گذشتن گر سر راهی چنین باشد

پای تو بخون مژه گلفام توان کرد ای شوخ بهر رنگ ترا رام توان کرد
هر چند که از جورِ تو در سینه نفس نیست آهی به اسلوب سرانجام توان کرد
گر دشمن بدکیش مرا بانه گذارد در سایهٔ دیوار تو آرام توان کرد
دستِ تو شفیق است تهی فصلِ بهاران پیمانه از پیرِ مغان وام توان کرد

چون کنم در دلِ خود نقش دل آرامی چند بر عقیقی نتوانم که کنم نامی چند
نیست معلوم که من بعد چه تدبیر کنند ماند در وعدهٔ آن ماه جبینان شامی چند

به لبِ نازکِ او بوسه توان داد شفیق — که مرا یاد کند باز بدشنامی چند

دوش دیدیم به کوی تو گرفتاری چند — در قدم بارسی چند ز دستاری چند
دلِ ما رفت به تاراج سرِ زلفِ بتان — مهرهٔ دولتِ ما بر و سیه ماری چند
گر رسد فصلِ گل امسال چه تدبیر شفیق — نیست باقی ز گریبان به گلو تاری چند

صبح دیدم به چمن غنچهٔ خندانی چند — پاره کردند به بوی تو گریبانی چند
مصحفِ روی تو ایمانِ دلِ صد کافر — هندوی خالِ تو اسلام مسلمانی چند
شانه رحمی کن و آشفته مکن دلها را — جمع گشتند در آن زلفِ پریشانی چند

لازم آمد مفلسی هر جا سخن گستر بود — سرو موزون مصرعِ دار د از آن بی بر بود

نگاهِ مستِ تو باز از ستم نخواهد ماند — بخواب امن غزال حرم نخواهد ماند
مکن به بسترِ گل ناز این قدر ای شیخ — که این نشستِ تو تا صبحدم نخواهد ماند

دمی که شورِ جنون آشکار خواهم کرد — هزار جیب [illegible] ثار بهار خواهم کرد
قسم به مصحفِ روشن بکعبهٔ رخ تو — طواف کوچهٔ او بار بار خواهم کرد
نه وعده نه نگهی نی پیام آه چه طور — تسلّی دلِ امیدوار خواهم کرد
نهالِ بید نشانم به تربیتِ مجنون — اگر غزالهٔ خود را شکار خواهم کرد
هزار تنگ شکر وقفِ طوطیان سازم — به آن شکرلب اگر چشم چار خواهم کرد
براهِ مقدمِ آن آفتابِ عالم تاب — چو شبنم نگران انتظار خواهم کرد

غبارِ من نه تواند که گردِ او گردد — چه سان رفاقتِ آن شهسوار خواهم کرد
دلم مسوز که این لعلِ بیش قیمت را — پس از وفات چراغِ مزار خواهم کرد
شنیده ام که به سوی شفیق می آئی — بیا بیا که دل و جان نثار خواهم کرد

غم نیست اگر از تو جفا شده باشد — بر غیر نشد بر سرِ ما شده باشد
ما به قدِ خم دیده خود گوشه گرفتیم — گر ماهِ نو انگشت نما شده باشد
ما را که سر چیدن و بو کردنِ گل نیست — گر بادِ سحر غنچه کشا شده باشد

دلِ شیفته کوی بتان شده باشد — لی من به تماشای جهان شده باشد
در خاطرم از جوشِ خیالی تو بهار است — گر باغ به تاراجِ خزان شده باشد

گر وحشتِ دل ساز فزون شده باشد — دیوانه از قید برون شده باشد
از کف ندهم شیوهٔ نیکوی خودی را — گر دشمنِ بدکیش زبون شده باشد
بی یاوری بختِ سکندر نه خورد آب — هر چند خضر راه نمون شده باشد
ساقی سرِ مینا و سحر بار سلامت — جامی اگر از دست نگون شده باشد

دید چون آئینه حیران گردید — سخت از کرده پشیمان گردید

به گمانِ روزِ محشر ز زمین برقص خیزم — اگر ای کشیده قامت به مزار خواهی آمد

هزار شیشهٔ دل را شکست و خود مخمور — کسی چو چشمِ سیاهِ تو اجتناب نه کرد

بیا بجانب حق امن خود اگر خواہی — کہ مرغ قبلہ نما را کسی کباب نہ کرد

با غیر ما ز لطف می ناب می کشد — بر ما ز غصہ تیغ سیہ تاب می کشد
چوں سرخ نقطہ کہ بود در میان بیت — قشقہ دو ابروی تو ز خوں ناب می کشد
اول بہ خون تازہ ما تر کند قلم — صورت گری کہ آں رخ شاداب می کشد

در زمیں ما نہال خود می کم می دمد — گلشن عشق تو ایں جا نخل ماتم می دمد
دست در داماں او برخیزم از زیر زمیں — ہم چو آں خار و گلی کز خاک با ہم می دمد
عشق را در سینہ عاشق بود نشو و نما — ایں شجر ایں جا بقدر قد آدم می دمد

یافتم در بزم می دزدیدہ دیدن ہائی تو — ایں قدر در عالم مستی مرا ہم ہوش بود

چو آں ہندو پسر تحریر دیوان سخن سازد — بہ ہر بیتی کہ می سازد لہ[1] از خون من سازد
کسی ہم با وجود خواب یابد می کند سودا — چہ ساں دیوانہ کوے تو با سیر چمن سازد

خوں شود آں دل کہ ما جانانہ الفت نہ کرد
رفتہ بہ جائی کہ قربانی دل آزاری نشد

خیال نرگس او در دل مستانہ می آید — خدا حافظ سیہ مستی بہ مینا خانہ می آید

---

[1] لفظ "لہ" کہ از شجرت بر بیت بی نوید معانی آں صور ہندی خون است "گل رعنا" فصل دوم صـ ۱۰۷

خال تو دل مرا خراشد — ایں زاغ چہ کاؤں کاؤں دارد

بہر ساغری بوسہ گلو سوزی — ازاں دو لعل لب جانفزد کہ می کردی

چہ مطلب است کہ دل را شکست و بست و کشاد
طلسم زندگی ما شکست و بست و کشاد

جواب نامہ چہ آید کہ عقل نادانی — پر کبوتر ما را شکست و بست و کشاد

کشد چہ گونہ مصور تمام شکل مرا — کہ در کشیدن چشم تو مست می گردد

نا اہل راز علم بصیرت کجا بود — در چشم کور خاک بہ از توتیا بود

خشک زدہ چوں برق کسی رفت ز پیشم — بہ بیند کہ آں دل بہ غبار رنہا شد

بر فتح چشم بر زاہداں دل کردہ — زلالی بادہ بنویسند بر کفن تعویذ
مناسب است ز سنگ دل توای شیریں — برائے تربت بیچارہ کوہ کن تعویذ

می کند آئینہ را از بس تماشا بیشتر — دل ربایاں را بود نما اندر دل ما بیشتر
شورشاں را فرو ننشاند مہر خاموشی — چشم او شد از جواہر سرمہ گویا بیشتر
بر نمی دارد کسی از شاخ آہو میوہ — میل ابرویش چرا داری تمنا بیشتر

یار شب تشریف آورده بشور آمد رقیب سگ نماید در شب مهتاب غوغا بیشتر

جوان دیوان که نام شاعراز شنجرف می دارد من مقتول آیم سرخ رو در دامن محشر

دله زابر ویت فغان دارد هنوز کشته تیغ تو جان دارد هنوز
سوختم در راه عشق او تمام بدگمان من گمان دارد هنوز
هم چو خورشیدی که باشد در سحاب چهرهٔ خود را نهان دارد هنوز

سرخی من چشم من از پیمانه پنهان است و بس
عکس چشم مست او در چشم حیران است و بس
مژده ای دل نو بهار آمد بچندین زور و شور
دست بر او پنجه من با گریبان است و بس
تا بروز حشر دارد زنده نام من شفیق
شعر تو در حق شاعر آب حیوان است و بس

چون چنالم که مرا ساخته اند بهر فریاد زدن هم چو جرس

منقبض چون غنچه گشتن خوب نیست هم چو گل با چهره بشاشش باش

مستی خوش است فصل بهاران علی الخصوص
برنا نسه حزین هزاران علی الخصوص

حال من مجنون به غزالان که کند عرض زنجیری شهرم به بیابان که کند عرض
در وقت مرض خیر به بیمار مفید است این حرف با آن نرگس فتان که کند عرض
امروز خبردار شد از حسن خود آن ماه این مژده به آئینه حیران که کند عرضه

نباشد حلقه حلقه زلف او در دامن عارض که بال افشاند طاوسی میان گلشن عارض

ای تغافل پیشه کی باشد روان ظالم این نمط غیر اخلی دمار انیست پیغامی نقط

گر شدم مجروح از تیغ تو ای ظالم چه شد زخم دل را می کند به مرهم زنگار خط

بهار عمر کجا می روی خدا حافظ ز کف چو رنگ حنا می روی خدا حافظ
عس ز شوخی مستان خبر نمی داری که سوی میکده ها می روی خدا حافظ
ز خارهای مغیلان پر است وادی عشق شفیق آبله پا می روی خدا حافظ

مژه کی گریه را شود مانع سیل را خس کجا شود مانع
طالب دیدنم نه گل چینم چمن آرا چرا شود مانع
از در او کناره می خواهم لیک شرط وفا شود مانع

رنگ مهرو بان بپرد از آمد از خورشید من
گل کند چون صبح کم گردد چراغان را فروغ

هوای ابر اگر می کند ترا تکلیف بساز شیشه تهی بر بجا کند تکلیف

بغیر کفر گزیدن مرا گزیری نیست   که گیسوی تو چه اخط جدا کند تکلیف

چشم او دیده ز استاد گرفتیم سبق   ما ہمیں عین و ہمیں صاد گرفتیم سبق
سرد موزوں بہ چمن درس ز ما می گیرد   ما که از حضرت آزاد گرفتیم سبق
جیب را چاک نمودن ز گل آموخته ایم   ناله از بلبل ناشاد گرفتیم سبق

می ستاند اعتقاد آخر مرا و دل ز سنگ   برہمن مقصود خود را می کند حاصل ز سنگ

حرف و صوتی نیست در ہنگامه ساز انجمن   یک قلم گویا تراشیدند آں محفل ز سنگ
ناقصاں را سختی دوراں به اصلاح آورند   آب تیغ کند آخر می شود کامل ز سنگ
سخت حیرانم که می گردد چساں صحبت برار   منکه دارم دل ز مینا او که دارد دل ز سنگ

می کند داغ شب و روز مرا زاری دل   کس گرفتار مبادا به گرفتاری دل
بند شد در گره طره مشکین کسی   کیست جز شانه که آید به مددگاری دل
کعبه را کیست که تعمیر کند از کفار   ہندوی خال تو آسوده ز معماری دل

صد چمن را رنگ افزودم بہار کیستم   داغہا را و انمودم لاله زار کیستم
دامنی پر کرده دارم ز مروارید اشک   سخت حیرانم که در فکر نثار کیستم
صد چمن گل کرد آخر گشت ہنگام بہار   چشم نرگس گشته ام در انتظار کیستم

بعید دل نگاه او خبردار است می دانم   بکار خویشتن این مست ہشیار است می دانم

حیا ہر لحظه مهری می زند درج دہانت را   سخن گفتن به عاشق بر تو دشوار است می دانم
ز قفل منکری اما زبانت می کند لکنت   ترا انکار آں در رنگ اقرار است می دانم
دل روشن نیاز طره مشکین او کردیم   شب تار ترا این شمع در کار است می دانم
صبا از کوچه او گر نمی آید نمی رنجم   که روزی چند شد بیمار بیمار است می دانم

تا قیامت ناتوانم ز مکاں بر خیزم   زلف او بسته میفگند چه ساں بر خیزم
من سپند توام ای شعله چه اله حسن   گرد سر گرم رسی رقص کناں بر خیزم

نه از طوبی نه از بال ہما امداد می خواہم   بفرق خویش ظل عالی آزاد می خواہم
عناں اختیار خویشتن را از ہوا خواہی   به دست خورد سالاں ہم چو کاغذ باد می خواہم
ز خط سرد خط تیغ من باید شفیق آراستا   که از دل بندگی حضرت آزاد می خواہم

از سوز دل خود به تو آگاه نه کردیم   تا طبع تو ناخوش نشود آه نه کردیم
از باغ تو گل چید کسی کس اثری یافت   ما ائیم که تو بر به پر کاه نه کردیم

از تیشه شکل شیریں مردانه می تراشم   فرہادم و ز خارا جانانه می تراشم
رندی است قصه من از تسبیح پارسائی   آورده شاخ دره صد دانه می تراشم
گردید نو خط من سرگرم میکشی ہا   از قطعه زمرد پیمانه می تراشم

گل سر سوی گشتم شانه گردیدم صبا گشتم   به چندین شیوه گشتم تا به زلفش آشنا گشتم
باین منت که شاید جا دہد در گوش خود جانا   طلائی حلقه گردیدم گہر گشتم صدا گشتم

چه کوشش ها که کردم تا گرفتم کام ازان لب
نداد آن بی وفا ره بر در دولت سرای خود
رسید از سایه من پادشاه کشور خوبی
روم تا در رکاب لیلی خود حیله ها کردم
شفیق از اهل دنیا خواستم پهلو تهی سازی

شراب ناب گشتم برگ پان گشتم نوا گشتم
عبث زنجیر گشتم حلقه گردیدم گدا گشتم
اگرچه ابر گشتم چنبر گردیدم هما گشتم
غبار ره گشتم سایه گردیدم درا گشتم
زلال خضر گشتم کیمیا گشتم وفا گشتم

تبسم از لب لعل تو می خواهم مکیدن هم   حدیث دل نوازی حرف دشنامی شنیدن هم
رخ بیگانه را نظاره کردن کفر می دانی   ترا آخر زیان خواهد رساند آیینه دیدن هم
نمی دانم به وصل یار سازم یا به هجرانش   طپیدن سخت مشکل بود دل من آرمیدن هم
سرشک دیده ام را منع کردی از تراویدن   چه دشوار است برگشتن به سوی دل چکیدن هم
شفیق ما نه تنها گرد سر گشتن طمع دارد   برنگ پیرهن خواهد ترا در بر کشیدن هم

شمع را گو که چو جانان سحر آید در چشم   ورنه هر زشت بشب خوب نماید در چشم

یاد ایامی که عشق نوجوانی داشتم   بر سر بازار رسوائی دکانی داشتم.

اگر آن صنم درآید به ادا و ناز کردن   به خدا که فرض گردد دل و دین نیاز کردن
گله بی شمار دارم ز مزاج زود رنجت   که بدامن تو دستی نتوان دراز کردن

چه فیض ها که بمردم رساند همت تو   ضرور بر همه عالم دعای دولت تو
رساند تا به فلک قدر خاکساران را   خدا زیاده کند اقتدار حضرت تو

برنگ شانه که بر زلف حکم او جاری است   تمام هند بود زیر دست قدرت تو

می روم گرچه ازین باغ ولیکن یارب   باد از دامن گل پنجه گل چین کوتاه

رسید باده کشان را نوید خوش حالی   که آمد ابر سیه "مد ظله العالی"
زبان به شکوه چوں برگ حنا نیالایم   که آفرینش ما شد برای پامالی

دلم گم شد بزلف خوبروی   شفیق اکنون خدا را جستجوی

رباعی

اخلاص من و تو بیش از حد باشد   با یکدگر اتحاد سرمد باشد
باشیم بظاهر و باطن یکتا   این نسخهٔ واحد دو مجلد باشد

یارب بدر تو عذر خواه آمده ام   سرتا بقدم غرق گناه آمده ام
از چشمه عفو شست و شوی فرما   در بارگهت نامه سیاه آمده ام

تاریخہائے طبع

از نتیجہ فکر محمد عارف فرید ایوبی فنکار سنڈیلوی

بہ بزم علم چو ساجد از پی نوشتہ تو
حیات و نثر و کلام شفیق یافت بقا
نوشت از پئے تاریخ خامۂ فنکار
برائی اہل ادب طبع شد کتاب شما

۱۴۰۵ھ

از نتیجہ قلم سید محمد تقی علی وفا عابدی

تمہاری خدمت علم و ادب کہی اے ساجد
جہان علم و ادب میں دوام رکھتی ہے
دل ادب سے وفا نے لکھی ہے یہ تاریخ
کتاب تیری ادب میں مقام رکھتی ہے

۱۹۸۱ + ۴ = ۱۹۸۵ء

از ساجد حمید پوری

ایں کتاب حال و آثار شفیق
در ادب تابندہ مثل شمع شد
در سنہ ہجری است تاریخش رقم
کاوش ساجد بہ خوبی طبع شد

۱۴۰۵ھ

اشاریہ (اشخاص)

"الف"

"د"

"ذ"

"ر"

"ز"

"س"

"ش"

"ق"

"ک"

"گ"

"ل"

"م"

"ن"

اشاریہ (کتب)

"الف"

"ب"

"ت"

"ج"

"چ"

"ح"

"خ"

"د"

"ر"

"ز"

"س"

"ش"

"ص"

"ض"

"ط"

"ع"

"غ"

"ف"

"ق"

ماخذ (مطبوعات)

نمبر شمار	اسمائے کتب	مصنف/مولف	مرتب/مترجم	سنہ تالیف	سنہ طبع	ناشر/مطبوعہ
۱۔	باغ و بہار حسن	مولانا عباس یکیتی	–	سنہ ۱۳۰۰ھ	سنہ ۱۳۰۳ھ	مطبع جعفری نخاس لکھنؤ
۲۔	بزم تیموریہ	صباح الدین عبدالرحمن	–	–	سنہ ۱۹۴۸ء	–
۳۔	بست مقالہ قزوینی	میرزا محمد خاں ابن عبدالوہاب	–	سنہ ۱۹۲۶ء	سنہ ۱۹۲۸ء	انجمن زرتشتیان ایرانی بمبئی
۴۔	بہار سخن	شیام سندر لال برق سیتاپوری	–	سنہ ۱۹۳۲ء	سنہ ۱۹۳۲ء	مطبع ایل بی سیتاپور
۵۔	پنجاب میں اردو	محمود شیرانی	–	–	سنہ ۱۹۸۲ء	یوپی اردو اکاڈمی لکھنؤ
۶۔	تاریخ ادبیات ایران	رضا زادہ شفق	مبارز الدین رفعت	سنہ ۱۹۴۹ء	سنہ ۱۹۶۹ء	ندوۃ المصنفین دہلی
۷۔	تاریخ فرشتہ	قاسم فرشتہ	محمد فدا علی طالب	–	سنہ ۱۹۲۶ء	مطبع عثمانیہ حیدرآباد
۸۔	تاریخ فیروز شاہی	ضیاء الدین برنی	–	–	–	–
۹۔	تاریخ گلزار آصفیہ	خواجہ غلام حسین خاں زماں	–	سنہ ۱۲۶۰ھ	سنہ ۱۳۰۶ھ	مطبع محمدی
۱۰۔	تاریخ ہند	نواب علی قریشی	–	–	سنہ ۱۹۵۳ء	کتاب پریس کانپور

نمبر شمار	اسمائے کتب	مصنف/مولف	مرتب/مترجم	سنہ تالیف	سنہ طبع	ناشر/مطبوعہ
۱۱۔	تذکرہ حسینی	میر حسین دوست سنبھلی	–	سنہ ۱۱۶۳ھ	سنہ ۱۲۹۲ھ	مطبع نول کشور لکھنؤ
۱۲۔	تذکرہ شعرائے اورنگ آباد	محمد سردار علی	–	سنہ ۱۳۴۵ھ	سنہ ۱۳۴۵ھ	شمس الاسلام پریس حیدرآباد
۱۳۔	تذکرہ شعرائے ہنود	دیبی پرشاد بشاش	–	–	–	نولکشور پریس کانپور
۱۴۔	تذکرہ مخطوطات جلد ۴	محی الدین قادری زور	–	–	–	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد
۱۵۔	〃 جلد ۵	〃 〃	–	سنہ ۱۹۵۹ء	سنہ ۱۹۵۹ء	〃 〃
۱۶۔	تذکرہ نتائج الافکار	قدرت اللہ گوپاموی	عطا کاکوی	سنہ ۱۲۵۸ھ	سنہ ۱۹۶۸ء	–
۱۷۔	تصویر جاناں (مثنوی)	لچھمی نرائن شفیق	خواجہ حمید الدین شاہد	سنہ ۱۱۸۰ھ	سنہ ۱۹۵۷ء	مجلس اشاعت دکنی حیدرآباد
۱۸۔	چمنستان شعراء	〃 〃	مولانا عبدالحق	سنہ ۱۱۷۵ھ	سنہ ۱۹۴۰ء	–
۱۹۔	خزانہ عامرہ	میر غلام علی آزاد	–	سنہ ۱۱۶۷ء	سنہ ۱۸۷۱ء	مطبع نول کشور کانپور
۲۰۔	خم خانہ تصوف	ظہور الحسن شارب	–	–	سنہ ۱۹۸۱ء	پریس آفسیٹ نئی دہلی
۲۱۔	خوش معرکہ زیبا	سعادت خاں ناصر	–	–	سنہ ۱۹۶۸ء	–
۲۲۔	دکن کے بہمنی سلاطین	ہارون رشید خاں شیروانی	–	–	سنہ ۱۹۷۸ء	نیشنل بک ٹرسٹ دہلی

نمبر شمار	اسمائے کتب	مصنف/مولف	مرتب/مترجم	سنہ تالیف	سنہ طبع	ناشر/مطبوعہ
۲۳-	دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	-	-	سنہ ۱۹۶۳ء	نسیم بکڈپو لکھنؤ
۲۴-	سخندان فارس	محمد حسین آزاد	-	سنہ ۱۸۸۶ء	سنہ ۱۹۶۹ء	یوپی اردو اکادمی لکھنؤ
۲۵-	سفینۂ خوشگو	بندرابن داس خوشگو	-	-	-	-
۲۶-	سفینۂ ہندی	بھگوان داس ہندی	-	-	-	-
۲۷-	سکندرنامہ	نظامی گنجوی	-	-	سنہ ۱۲۷۸ھ	نول کشور پریس
۲۸-	شام غریباں	لچھمی نرائن شفیق	محمد اکبرالدین صدیقی	سنہ ۱۹۷۰ھ	سنہ ۱۹۷۷ء	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی
۲۹-	شعر العجم جلد ۱	علامہ شبلی نعمانی	-	سنہ ۱۹۰۷ء	سنہ ۱۹۶۲ء	مطبع معارف اعظم گڑھ
۳۰-	" جلد ۵	"	-	سنہ ۱۹۱۸ء	سنہ ۱۹۵۶ء	"
۳۱-	شعرائے اردو کے تذکرے	ڈاکٹر حنیف نقوی	-	-	سنہ ۱۹۷۶ء	نسیم بکڈپو لکھنؤ
۳۲-	شمع انجمن	سید محمد صدیق حسن	-	-	-	رئیس المطابع شاہجہانی
۳۳-	عاد السعادت	غلام علی نقوی (میرزا قتیل)	-	سنہ ۱۲۲۲ھ	سنہ ۱۸۶۴ء	مطبع نولکشور لکھنؤ
۳۴-	فارسی ادب کے ارتقا کی مختصر تاریخ	ذبیح اللہ صفا	عندلیب زہرا	-	سنہ ۱۹۷۵ء	نامی پریس لکھنؤ

نمبر شمار	اسمائے کتب	مصنف/مولف	مرتب/مترجم	سنہ تالیف	سنہ طبع	ناشر/مطبوعہ
۳۵-	فارسی اور ہندوستان	ڈاکٹر نذیر احمد	-	سنہ ۱۹۷۴ء	سنہ ۱۹۷۶ء	خدابخش لائبریری پٹنہ
۳۶-	فرہنگ سخنوران	خیام پور	-	-	-	آذربائیجان
۳۷-	گل رعنا (فصل ۲)	لچھمی نرائن شفیق	-	سنہ ۱۱۸۲ھ	-	عہد آفرین پریس حیدرآباد
۳۸-	محبوب الزمن (جلد ۱)	ابوتراب عبدالجبار خاں	-	سنہ ۱۳۲۹ھ	سنہ ۱۳۲۹ھ	مطبع رحمانی حیدرآباد
۳۹-	" (جلد ۲)	" "	-	"	"	"
۴۰-	نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان	نریندر بہادر سریواستوا	-	-	سنہ ۱۹۶۹ء	شہناز پبلی کیشن بریلی
۴۱-	ہمیشہ بہار	کشن چند اخلاص	محمد اکبرالدین صدیقی	سنہ ۱۱۶۱ھ	سنہ ۱۹۷۷ء	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی
۴۲-	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے	مجلس دارالمصنفین		-	سنہ ۱۹۶۳ء	دارالمصنفین اعظم گڑھ
۴۳-	بھارت ورش کا اتہاس	ایشوری پرشاد	-	سنہ ۱۹۳۵ء	سنہ ۱۹۳۶ء	-

نوٹ:۔ صرف آخری کتاب ہندی زبان میں ہے۔ باقی کتابیں اردو و فارسی کی ہیں۔

Personal note

After receiving 8 above Book I wrote a detailed letter with reference. But till today he did not reply me. Scholar have not try to see above mentioned Book with where very much interely [illegible] and he may get more and more meterial on his subject and his research subject. This is Best item as book my be ... said.

Some important book on subject are in one library and some other can be collect from different private library of Scholar is very much interested in his subject.

ماخذ مخطوطات

Hand Written — Manuscripts

نمبر شمار	اسمائے کتب	مصنف / مؤلف	سنہ تالیف	سنہ کتابت	نسخہ
۱۔	انشائے لچھمی نرائن	منشی لچھمی نرائن	سنہ ۱۲۰۵ھ	سنہ ۱۲۷۰ھ	سلطانیہ لائبریری سلطان المدارس لکھنؤ
۲۔	تحفۃ القوانین	غلام یٰسین	سنہ ۱۲۰۰ھ	سنہ ۱۲۴۶ھ	" "
۳۔	حدیقۃ الارشاد	محمد صادق اختر بنگالوی	—	—	" "
۴۔	سیر المتاخرین	غلام حسین	—	—	امیر الدولہ پبلک لائبریری قیصر باغ لکھنؤ
۵۔	عماد السعادت	غلام علی رضوی[۱] عرف میرزا قتیل	سنہ ۱۲۲۲ھ	سنہ ۱۲۳۳ھ	سلطانیہ لائبریری سلطان المدارس لکھنؤ
۶۔	نشتر عشق جلد اول	حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی	سنہ ۱۲۳۳ھ	—	" " "
۷۔	" جلد دوم	" " "	سنہ ۱۲۳۳ھ	—	" " " "

نوٹ :- تمام مخطوطات فارسی زبان میں ہیں ۔

[۱] عماد السعادت مطبوعہ نول کشور سنہ ۱۸۶۴ء میں موصوف کو "نقوی" لکھا گیا ہے لیکن قلمی نسخہ جس کی کتابت سید کاظم علی نے سنہ ۱۲۳۳ھ میں مکمل کی اس میں "رضوی" لکھا ہے اس لیے میرے نزدیک یہی معتبر ہے کیونکہ قلمی نسخہ تصنیف کے بہت ہی کم عرصہ بعد لکھا گیا ہے (ساجد)

Sajid Zaidpuri ساجدؔ زیدپوری